ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد۲۱ شمارہ۱ جنوری۲۰۰۹ ذوالحجہ۱۴۲۹/محرم۱۴۳۰

فہرست

جاوید احمد غامدی

رویت ہلال کا مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لیے رمضان اور حج کے لیے ذوالحجہ کا مہینا مقرر فرمایا ہے۔ یہ دونوں قمری مہینے ہیں، اِس لیے یہ سوال ابتدا ہی سے زیر بحث رہا ہے کہ اِن کی تعیین کس طرح کی جائے؟ علم فلکیات نے جو ترقی اِس زمانے میں کی ہے، اُس سے پہلے بھی لوگ اِس بات سے تو واقف تھے کہ قمری مہینے تیس دن سے زیادہ کے نہیں ہو سکتے، مگر عام مشاہدہ بتاتا تھا کہ یہ انتیس دن کے بھی ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے جب لوگوں کو پورے مہینے کے روزے رکھنے کا حکم دیا تو اندیشہ ہوا کہ اُن میں سے کچھ لوگ اِس حکم کی تعمیل میں تیس دن پورے کرنے پر اصرار کریں گے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ چاند نظر آ جائے تو رمضان کا مہینا شروع کر لینا چاہیے اور نظر آ جائے تو اُس کو ختم کر دینا چاہیے۔ اِس کے لیے تیس دن پورے کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں، مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن لازماً پورے کیے جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے جسے راویوں نے اپنے تصرفات سے وہ صورت دے دی جس سے یہ تاثر عام ہو گیا کہ آپ نے مہینے کی تعیین کے لیے لوگوں کو چاند دیکھنے کا پابند کر دیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ روایت کے ایک طریقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اپنی اصل صورت میں بھی نقل ہو گئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

الشھر تسع وعشرون، فاذا رأیتم الھلال فصوموا، واذا رأیتموہ فافطروا، فان غم علیکم فاقدروا لہ.

(مسلم، رقم ۱۰۸۰)

”مہینا انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، اِس لیے چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور دیکھ لو تو افطار کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو دن پورے کر لو۔“

یہ عبد اللہ بن عمر کی روایت ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ایک طریق میں بھی بعینہٖ یہی الفاظ ہیں۔

اِس سے واضح ہے کہ مہینے کی تعیین کے لیے چاند دیکھنے کو لازم نہیں کیا گیا، بلکہ چاند دیکھ لینے کے بعد مہینا شروع کر لینے کو لازم ٹھیرایا گیا ہے تاکہ لوگ یہ خیال کرکے کہ قرآن نے پورے مہینے کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے، تیس دن پورے کرنے پر اصرار نہ کریں۔ چنانچہ بات کی ابتدا ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ 'الشھر تسع وعشرون'، مہینا انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔

چاند دیکھنے کی ضرورت اِسی بنا پر ہے۔ تیس دن پورے ہو جائیں تو یہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اِس لیے کہ اِس معاملے میں ہمارا علم بالکل قطعی ہے۔ چاند نظر آئے یا نہ آئے، ہم جانتے ہیں کہ پچھلا مہینا ختم ہوا اور اگلا مہینا شروع ہو چکا ہے۔ علم کی ترقی نے یہی صورت انتیس کے بارے میں بھی پیدا کر دی ہے۔ اب ہم پوری قطعیت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کے لیے چاند کی پیدایش کب ہو گی۔ اِس لیے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر اگر چاند کی پیدایش کے لحاظ سے قمری کیلنڈر بنا دیا جائے اور تمام مذہبی تہوار اُسی کے مطابق منائے جائیں تو اِس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ دین کا منشا مہینے کی تعیین ہے۔ وہ اگر چاند دیکھنے سے ہو سکتی تھی تو اُس نے اُسے اختیار کیا اور اب اگر کسی دوسرے ذریعے سے ہو سکتی ہے تو اِس پر بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع و غروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اِسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔ یہ مسئلہ محض ایک حدیث میں راویوں کے تصرفات سے پیدا ہوا ہے۔ روایت کے تمام طریقوں کو دیکھنے سے یہ حقیقت بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بالکل دوسرا تھا۔

چاند دیکھنے پر اصرار کے لیے اِس کے بعد بھی کوئی وجہ باقی رہ جاتی ہے؟ ہمارے علما کو اب اِس پر غور کرنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة المائدہ

(۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ: یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ، وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا، وَّاٰتٰکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾ یٰقَوْمِ

(اپنے جرائم کی پاداش سے ڈرو، اے اہل کتاب) اور یاد کرو وہ واقعہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کی اِس نعمت کا خیال کرو کہ اُس نے تم میں نبی بنائے اور تمھیں بادشاہ ٹھیرایا ہے[۶۳] اور وہ کچھ دے دیا ہے جو دنیا والوں میں سے اُس نے کسی کو نہیں دیا ہے[۶۴]۔ اے میری

[۶۳] اصل میں 'جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل ہمارے نزدیک فیصلۂ فعل کے معنی میں ہے، یعنی نبی اور بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ وعدوں کی قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک بلیغ اسلوب ہے۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بادشاہی کا منصب ایک اجتماعی منصب ہے جو پوری قوم کو دیا جاتا ہے۔ اِس میں کسی شخص یا خاندان کے استبداد اور مطلق العنانی کے لیے ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ نبیوں کے لیے تو فرمایا ہے کہ 'جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ'، لیکن بادشاہی کے لیے 'جَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

[۶۴] اِس سے مراد شہادت علی الناس اور دنیا کی امامت کا وہ منصب ہے جس کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام

اُدۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ، وَلَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوۡا: یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ فِیۡہَا قَوۡمًا جَبَّارِیۡنَ وَاِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَہَا حَتّٰی یَخۡرُجُوۡا مِنۡہَا، فَاِنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَا فَاِنَّا دٰخِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ

قوم کے لوگو، (اِس کے لیے) اُس مقدس سرزمین[۶۵] میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھ پر الٹے نہ پھرو، ورنہ نامراد ہو جاؤ گے۔[۶۶] اُنھوں نے جواب دیا: موسیٰ، اُس میں بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں، ہم اُس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے، جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں، اگر وہ نکل جائیں تو ہم یقیناً داخل ہو جائیں گے۔[۶۷] اِن ڈرنے والوں میں دو شخص، البتہ ایسے تھے

کی ذریت کو بالکل اُسی طرح منتخب کیا گیا، جس طرح اللہ تعالیٰ بنی آدم میں سے بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

[۶۵] اِس سے فلسطین کا علاقہ مراد ہے۔ اِس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ذریت ابراہیم میں سے جس طرح بنی اسمٰعیل کی دعوت کے لیے سرزمین عرب کا انتخاب کیا گیا، اِسی طرح بنی اسحٰق کی دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس علاقے کا انتخاب فرمایا اور اِس کو یہ تقدس بخشا کہ لوگ علم و عمل کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اِس سرزمین کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ اِسی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں وہ مسجد تعمیر ہوئی جسے بیت المقدس کہا جاتا ہے۔

[۶۶] سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر اُس موقع پر کی ہے، جب اُنھوں نے دشت فاران میں بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ حملہ اِس لیے ضروری تھا کہ فلسطین کے علاقے کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی میراث کا علاقہ قرار دے کر اُنھیں حکم دیا تھا کہ اِس علاقے کو اپنی دعوت کا مرکز بنائیں۔ نبیوں کی قیادت میں جو حکومت قائم ہوتی ہے، وہ چونکہ براہ راست اللہ کی حکومت ہوتی ہے، اِس لیے اُس کو جس طرح اتمام حجت کے بعد لوگوں کی جزا و سزا کا حق حاصل ہو جاتا ہے، اِسی طرح یہ حق بھی آپ سے آپ حاصل ہو جاتا ہے کہ جس علاقے سے چاہے، لوگوں کی حکومت ختم کر کے اُس میں اپنی حکومت قائم کر دے۔ اِس کا عام انسانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کی حکومت کو یہ حق نہ حاصل ہے اور نہ کسی طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی یہ تقریر اگرچہ یہاں بالاجمال نقل ہوئی، لیکن غور کیجیے تو اِس میں وہ تمام پہلو موجود ہیں جو اِس موقع پر حوصلہ دینے اور پست حوصلگی کے برے انجام سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ضروری تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

الَّـذِیْـنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمَا، ادْخُلُوْا عَلَیْھِمُ الْبَابَ، فَاِذَا دَخَلْتُمُوْہُ فَاِنَّکُمْ

جن پر خدا کی عنایت تھی،[۶۸] اُنھوں نے کہا: تم (اِس شہر کے) لوگوں پر چڑھائی کرکے اِس کے دروازے میں

’’...حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اُن افضال و عنایات کا حوالہ دیا جو مصر سے خروج کے وقت سے لے کر اب تک برابر سایے کی طرح بنی اسرائیل کے ساتھ رہے، اُن قطعی اور حتمی وعدوں کا حوالہ دیا جو سلسلۂ نبوت کے اجرا اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم حکمران قوم بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمائے، اُس میراث کا حوالہ دیا جو ایک شاداب و زرخیز علاقہ کی شکل میں اُن کو ملنے والی تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے لکھ دیا تھا۔ اِن تمام وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ اُن کو ارض مقدس پر حملے کی دعوت دی اور ساتھ ہی بزدلی اور پست حوصلگی کے انجام بد سے بھی آگاہ کر دیا کہ قدم پیچھے ہٹایا تو بالکل ہی نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔ پیچھے مصر کی غلامی ہے اور آگے کے لیے ہمت نہ کی تو یہ صحرا گردی ہے جس میں مرکھپ کر فنا ہو جاؤ گے۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۴۸۸)

[۶۷] بائیبل کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ باتیں اُس وقت کہیں، جب بارہ سرداروں کی اُس جماعت نے اپنی رپورٹ آکر پیش کی جو موسیٰ علیہ السلام نے حملے سے پہلے علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی تھی۔ بائیبل میں یہ رپورٹ اِس طرح نقل ہوئی ہے:

’’...وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اُس میں سے گزرے، ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے، وہ سب بڑے قدآور ہیں، اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی اُن کی نگاہ میں تھے۔‘‘ (گنتی ۱۳: ۳۲-۳۳)

[۶۸] اصل میں ’رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’رَجُلٰنِ‘ (دو شخص) سے مراد یوشع اور کالب ہیں جو اُس مہم کے ارکان تھے جو فلسطین کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی اور ’الَّـذِیْنَ یَخَافُوْنَ‘ کے الفاظ بنی اسرائیل کے لیے آئے ہیں جو بنی عناق کے خوف سے ہمت ہار بیٹھے تھے اور اُن پر خوف اور بزدلی کی موت طاری ہو گئی تھی۔ اِس آیت میں عام طور پر لوگوں نے ’یَـخَافُوْنَ‘ کے مفعول کو محذوف مانا ہے، یعنی ’یَـخَافُوْنَ اللّٰہَ‘، وہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے، لیکن دو وجہ سے یہ تاویل محل نظر ہے۔ استاذ امام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’...ایک تو یہ کہ یہ موقع مفعول کے اظہار کا تھا نہ کہ اِس کے حذف کا، اِس لیے کہ یہاں التباس پیدا ہو سکتا ہے اور

غٰلِبُوْنَ، وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا: يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ

گھس جاؤ، جب تم گھس جاؤ گے تو تمھی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسا کرو، اگر تم اُس کے ماننے والے ہو۔[۶۹]

التباس کے مواقع میں اظہار مستحسن ہے نہ کہ حذف۔ دوسری یہ کہ اِس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اُس وقت خدا سے ڈرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی جن کے اندر یوشع اور کالب بھی تھے۔ اگر یہ بات ہے تو انعام الٰہی کی تخصیص اِنھی دو حضرات کے لیے کیوں ہوئی؟ پھر تو 'اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا' کی جگہ 'اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ' ہونا تھا۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۴۸۹)

[۶۹] یہ اُس تقریر کا خلاصہ ہے جو یوشع اور کالب نے اُس موقع پر کی، جب پوری قوم ہمت ہار چکی تھی۔ بائیبل میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

''اور نون کا بیٹا یشوع اور یفنہ کا بیٹا کالب جو اُس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے، اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اُس میں سے گزرے، نہایت اچھا ملک ہے۔ اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اُس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، ہم کو دے گا۔ فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اُس ملک کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں۔ اُن کی پناہ اُن کے سر پر سے جاتی رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو اُن کا خوف نہ کرو۔'' (گنتی ۱۴: ۶-۹)

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس تقریر پر تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...اِس میں شبہ نہیں کہ جب پوری قوم کی قوم اِس طرح ہمت ہار بیٹھے جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہوتا ہے وہ مرد حق جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جائے۔ یوشع اور کالب کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کے سبب سے عہد و میثاق کی اِس سورہ میں قرآن نے اِن کا ذکر کر کے اِن کو زندۂ جاوید بنا دیا تا کہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا ارادہ کریں، وہ اُن کے اِس مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جائیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں اور جب سب مر جاتے ہیں تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر کے بہادروں اور مردوں کے اندر کے زندوں کو اِس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آ جائیں گے، لیکن وہ زندگی بخش ہستیاں بہت کم یاب ہیں جو مردوں کو زندگی بخشتی

نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا، فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

قَالَ: رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ، فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ، فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

لیکن اُنھوں نے پھر یہی کہا کہ موسیٰ، جب تک وہ وہاں موجود ہیں، ہم اُس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے، اِس لیے تم اور تمھارا پروردگار، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں[۷۰]۔ ۲۰-۲۴

اِس پر موسیٰ نے دعا کی: پروردگار، میری ذات اور میرے بھائی کے سوا کسی پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، لہٰذا تو ہمیں اور اِن نافرمان لوگوں کو الگ الگ کر دے[۷۱]۔ فرمایا: یہی بات ہے تو یہ سرزمین چالیس برسوں کے لیے اُن پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے، اِس لیے (اب) اِن نافرمانوں پر افسوس نہ کرو[۷۲]۔ ۲۵-۲۶

ہیں، اگرچہ اسی راہ میں اُنھیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۸۹-۴۹۰)

[۷۰] یہ بنی اسرائیل کی طرف سے آخری جواب ہے۔ بائیبل میں یہ جواب اِن لفظوں میں تو نقل نہیں ہوا، مگر بنی اسرائیل کے گریہ و ماتم کا ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یوشع اور کالب کی اِس یقین دہانی کے جواب میں کہ ''ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو اِن کا خوف نہ کرو''، اُنھوں نے یقیناً وہی بات کہی ہوگی جو قرآن نے یہاں نقل کی ہے۔

[۷۱] یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اِس بات کی درخواست ہے کہ اُنھیں اِس نالائق قوم کی قیادت کے بارِ عظیم سے سبک دوش کر دیا جائے۔

[۷۲] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سبک دوشی کی درخواست تو قبول نہیں کی گئی، اِس لیے کہ اِس صورت میں تمام بنی اسرائیل ہلاک کر دیے جاتے، مگر اُن کے لیے سزا کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ بائیبل میں یہ فیصلہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا: میں کب تک اِس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتی رہتی ہے، برداشت کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں، میں نے وہ سب شکایتیں سنی ہیں۔ سو تم

اُن سے کہہ دو: خداوند کہتا ہے، مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسا تم نے میرے سنتے کہا ہے، میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا۔تمھاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمھاری ساری تعداد میں سے، یعنی بیس برس سے لے کر اُس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے، اُن میں سے کوئی اُس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا، سوا یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع کے۔ اور تمھارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھیریں گے، اُن کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا، وہ اُس کی حقیقت پہچانیں گے۔ اور تمھارا یہ حال ہوگا کہ تمھاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمھارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں آوارہ پھرتے اور تمھاری زناکاریوں (یعنی بدعہدیوں) کا پھل پاتے رہیں گے۔'' (گنتی ۱۴: ۲۶-۳۳)

استاذ امام لکھتے ہیں:

''...تاریخ بنی اسرائیل کے اِس واقعے نے اُن کے اُس زعم کی پوری پوری تردید کر دی جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے محبوب اور چہیتے سمجھتے ہیں، اِس وجہ سے عمل واطاعت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بری خیال کیے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے تو موسیٰ کی موجودگی میں تو تم اور بھی زیادہ چہیتے تھے پھر اُس وقت ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے ڈگ ڈال دیے تھے تو خدا خود تمھیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتا اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیتا۔ پھر خدا کی جنت کو تم یونہی مفت میں حاصل کرنے کے خبط میں کیوں مبتلا ہو!''

(تدبرقرآن ۲/ ۴۹۲)

[باقی]

محمد رفیع مفتی

آبا و اجداد کی قسم کھانے کی مناہی

رُوِیَ[1] اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ أَدْرَكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَهُوَ یَسِیْرُ فِیْ رَكْبٍ فِیْ غَزَاةٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ[2] وَهُوَ یَحْلِفُ بِأَبِیْهِ، وَهُوَ یَقُوْلُ وَأَبِیْ وَأَبِیْ[3] وَكَانَتْ قُرَیْشٌ تَحْلِفُ بِآبَائِهَا[4] فَنَادَاهُمْ[5] رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أَلَا[6] اَنَّ اللّٰهَ یَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ لِیَصْمُتْ، لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ حَلَفَ بِالْمَسِیْحِ هَلَكَ وَالْمَسِیْحُ خَیْرٌ مِّنْ آبَائِكُمْ[7]. قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفْتُ بِهَا مُنْذُ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا[8].

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (قافلے کے پچھلے حصے سے آگے بڑھتے ہوئے) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے آ ملے، وہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک غزوے میں جانے کے لیے، سواروں کے دستے میں شامل تھے اور (کسی بات پر) اپنے باپ کی قسم کھاتے

ہوئے ''میرے باپ کی قسم''، ''میرے باپ کی قسم'' کے الفاظ کہہ رہے تھے اور قریش کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ (آپ نے انھیں ایسی قسم کھاتے ہوئے سن لیا) چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو پکار کر کہا: آگاہ رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمھیں آبا و اجداد کی قسمیں کھانے سے منع کیا ہے، جسے قسم کھانی ہو، وہ صرف اللہ کی قسم کھائے، ورنہ وہ چپ رہے۔ اگر تم میں سے کوئی مسیح کی قسم بھی کھائے گا تو بھی وہ ہلاک ہو جائے گا، حالاں کہ مسیح (بہر حال) تمھارے آبا و اجداد سے بہتر تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم جب سے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے، اس کے بعد پھر میں نے (آبا کی) وہ قسم نہ کبھی ارادۃً کھائی ہے اور نہ کبھی (کسی کی بات) روایت کرتے ہوئے کھائی ہے[1]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ انسان جس ذات کی قسم کھاتا ہے، اسے وہ اپنی بات پر گواہ ٹھیراتا اور اس پر اپنے توکل و اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔

کوئی انسان اپنے ارادے یا اپنے کسی موقف میں جھوٹا ہے یا سچا ہے، اس بات کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آبا و اجداد کی قسم کھانا دراصل انھیں اپنی نیت اور اپنے دل کے ارادوں پر گواہ ٹھیرانا ہے، یہ چیز ان میں بعض خدائی صفات کو ماننے کے مترادف ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عربوں کے ہاں آبا پرستی کا رجحان موجود تھا، وہ اپنے آبا کا ذکر بہت فخر سے کیا کرتے تھے اور اپنے عقائد میں ان کی اندھی تقلید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں توحید کے حوالے سے جہاں دوسرے بہت سے شرکیہ اعمال سے منع کیا ہے، وہاں آبا و اجداد کی قسمیں کھانے سے بھی منع فرمایا۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ روایت موطا، رقم ۱۰۲۰ ہے۔ بعض معمولی اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے

کچھ حصے حسب ذیل (۷۷) مقامات پر نقل ہوئے ہیں:

بخاری، رقم ۲۵۳۳، ۳۶۲۴، ۵۷۵۷، ۶۲۷۰-۶۲۷۲، ۶۹۶۶؛ مسلم، رقم ۱۶۴۶ (۵)، ۱۶۴۸؛ ابوداؤد، رقم ۳۲۴۸-۳۲۵۰؛ ترمذی، رقم ۱۵۳۳-۱۵۳۴؛ نسائی، رقم ۳۷۶۴-۳۷۶۹، ۳۷۷۴؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۹۴-۲۰۹۵، ۲۱۰۱؛ دارمی، رقم ۲۳۴۱؛ احمد بن حنبل، رقم ۱۱۲، ۲۴۰-۲۴۱، ۲۹۱، ۳۲۹، ۴۵۲۳، ۴۵۴۸، ۴۵۹۳، ۴۶۶۷، ۴۷۰۳، ۴۹۰۴، ۵۲۲۲، ۵۲۵۶، ۵۳۴۶، ۵۳۷۵، ۵۴۶۲، ۵۵۹۳، ۵۷۳۶، ۶۲۸۸، ۲۰۶۴۳؛ ابن حبان، رقم ۴۳۵۷، ۴۳۵۹-۴۳۶۲؛ بیہقی، رقم ۱۹۶۰۵-۱۹۶۱۳، ۱۹۶۱۵، ۱۹۶۱۷، ۲۰۵۱۲؛ ابویعلیٰ، رقم ۵۴۳۰، ۵۴۸۳، ۵۵۳۷، ۵۸۳۲، ۶۰۴۸؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۵-۱۲۲۸۰۔

بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۳۳ میں 'أَدْرَكَ' کے بجائے 'سَمِعَ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۴۹ میں 'أَدْرَكَ' کے بجائے 'سَمِعَهُ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۱ میں 'أَدْرَكَ' کے بجائے 'سَمِعَنِي' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۱ میں 'أَدْرَكَ' کے بجائے 'أَدْرَكَهُ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۴۹ میں 'وَهُوَ يَسِيرُ فِي رَكْبٍ فِي غَزَاةٍ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' کے بجائے 'وَهُوَ فِي رَكْبٍ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۰ میں 'وَهُوَ يَسِيرُ فِي رَكْبٍ فِي غَزَاةٍ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' کے بجائے 'كُنْتُ فِي رَكْبٍ أَسِيرُ فِي غَزَاةٍ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۴۵۹۳ میں 'وَهُوَ يَسِيرُ فِي رَكْبٍ فِي غَزَاةٍ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' کے بجائے 'وَهُوَ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۵۸۳۲ میں 'وَهُوَ يَسِيرُ فِي رَكْبٍ' کے بجائے 'وَهُوَ فِي رَكْبٍ يَسِيرُ مَعَهُمْ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۶ میں 'وَهُوَ يَسِيرُ فِي رَكْبٍ فِي غَزَاةٍ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' کے بجائے 'فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۶۶ میں 'أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدْرَكَ عُمَرَ بْنَ

الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ‘ کے بجاے ’سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرَ مَرَّةً ‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۱۰۱ میں ’وَهُوَ يَحْلِفُ بِأَبِيهِ وَهُوَ يَقُوْلُ وَأَبِيْ وَأَبِيْ‘ کے بجاے ’رَجُلًا يَحْلِفُ بِأَبِيهِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۶۲۷۰ میں ’يَحْلِفُ بِأَبِيهِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۱۶۴۶ میں ’وَعُمَرُ يَحْلِفُ بِأَبِيهِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۳۳ میں ’وَهُوَ يَقُوْلُ وَأَبِيْ وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۰ میں ’فَحَلَفْتُ فَقُلْتُ لَا وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۱ میں ’وَأَنَا أَحْلِفُ بِأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۹۱ میں ’فَحَلَفْتُ فَقُلْتُ لَا وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۴۵۲۳ میں ’وَهُوَ يَقُوْلُ وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۰۷ میں ’وَأَنَا أَحْلِفُ أَقُوْلُ وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۵ میں ’يَقُوْلُ وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۸ میں ’قَالَ عُمَرُ حَدَّثْتُ قَوْمًا حَدِيْثًا فَقُلْتُ لَا وَأَبِيْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۹ میں ’قَالَ حَلَفْتُ بِأَبِيْ‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۳۶۲۴ میں ’وَكَانَتْ قُرَيْشٌ تَحْلِفُ بِآبَائِهَا‘ کے بجاے ’فَكَانَتْ قُرَيْشٌ تَحْلِفُ بِآبَائِهَا‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۴۷۰۳ میں ’كَانَتْ قُرَيْشٌ تَحْلِفُ بِآبَائِهَا‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً موطا، رقم ۱۰۲۰ میں ’فَنَادَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ‘ کے بجاے ’فَقَالَ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۲۵۳۳ میں ’أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۶۲۷۱ میں ’عُمَرُ يَقُوْلُ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۶۲۷۲ میں ’قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۳۴ میں ’فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۰ میں ’فَنَهَرَنِيْ رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِيْ وَقَالَ ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۹۱ میں ’فَهَتَفَ بِيْ رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِيْ ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۶۱ میں ’فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۰ میں ’فَلَمَّا سَمِعَهُ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَھْلًا‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۵۸۳۲ میں ’فَنَادَاھُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۸ میں ’فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِیْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۹ میں ’وَإِذَا رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِیْ یَقُوْلُ‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً موطا، رقم ۱۰۲۰ میں ’أَلَا اَنَّ اللّٰہَ یَنْھَاکُمْ‘ کے بجاے ’اَنَّ اللّٰہَ یَنْھَاکُمْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۰ میں ’فَإِنَّ اللّٰہَ قَدْ نَھَاکُمْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۱۲ میں ’إِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَنْھَاکُمْ‘ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۶۲۷۲ میں ’أَلَا اَنَّ اللّٰہَ یَنْھَاکُمْ أَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِکُمْ‘ کے بجاے ’لَا تَحْلِفُوْا بِآبَائِکُمْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل ۵۷۳۶ میں ’فَلَا تَحْلِفُوْا بِآبَائِکُمْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۸ میں ’لَا تَحْلِفَنَّ بِآبَائِکُمْ‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۲۵۳۳ میں ’فَمَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ أَوْ لِیَصْمُتْ‘ کے بجاے ’مَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ أَوْ لِیَصْمُتْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۳۶۲۴ میں ’أَلَا مَنْ کَانَ حَالِفًا فَلَا یَحْلِفْ إِلَّا بِاللّٰہِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۵۷۵۷ میں ’فَمَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ وَإِلَّا فَلْیَصْمُتْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۶۹۶۶ میں ’وَمَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۱۶۴۶ میں ’مَنْ کَانَ حَالِفًا فَلَا یَحْلِفْ إِلَّا بِاللّٰہِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۳۴ میں ’لِیَحْلِفْ حَالِفٌ بِاللّٰہِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۷۶۴ میں ’مَنْ کَانَ حَالِفًا فَلَا یَحْلِفْ إِلَّا بِاللّٰہِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۴۵۲۳ میں ’فَإِذَا حَلَفَ أَحَدُکُمْ فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ‘ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۲۸۸ میں ’فَلْیَحْلِفْ حَالِفٌ بِاللّٰہِ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۵۹ میں ’فَمَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ أَوْ لِیَسْکُتْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۰ میں ’مَنْ حَلَفَ فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ أَوْ لِیَسْکُتْ‘ کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۱ میں ’فَلْیَحْلِفْ حَالِفٌ بِاللّٰہِ أَوْ لِیَسْکُتْ‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۸ میں ’وَھُوَ یَحْلِفُ بِأَبِیْہِ، وَھُوَ یَقُوْلُ وَأَبِیْ وَأَبِیْ

وَ كَانَتُ قُرَيُشٌ تَحُلِفُ بِآبَائِهَا فَنَادَاهُمُ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ: أَلَا اَنَّ اللّٰهَ يَنُهَاكُمُ أَنُ تَحُلِفُوُا بِآبَائِكُمُ فَمَنُ كَانَ حَالِفًا فَلُيَحُلِفُ بِاللّٰهِ أَوُ لِيَصُمُتُ، لَوُ أَنَّ أَحَدَكُمُ حَلَفَ بِالُمَسِيُحِ هَلَكَ وَالُمَسِيُحُ خَيُرٌ مِّنُ آبَائِكُمُ' کے بجاے 'قَالَ عُمَرُ حَدَّثُتُ قَوُمًا حَدِيُثًا فَقُلُتُ لَا وَأَبِيُ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنُ خَلُفِيُ لَا تَحُلِفَنَّ بِآبَائِكُمُ فَالُتَفَتُّ فَإِذَا رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَوُ أَنَّ أَحَدُكُمُ حَلَفَ بِالُمَسِيُحِ لَهَلَكَ وَالُمَسِيُحُ خَيُرٌ مِّنُ آبَائِكُمُ' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۹ میں 'أَنَّهُ (عُمَرُ) قَالَ حَلَفُتُ بِأَبِيُ وَإِذَا رَجُلٌ مِّنُ خَلُفِيُ يَقُوُلَ لَا تَحُلِفُوُا بِآبَائِكُمُ فَالُتَفَتُّ فَإِذَا هُوَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۹۱ میں 'فَقَالَ' کے بجاے 'فَهَتَفَ بِيُ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۴۹ میں 'لِيَصُمُتُ' کے بجاے 'لِيَسُكُتُ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۱۶۴۶ میں 'قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهَا مُنُذُ سَمِعُتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے بجاے ''قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهَا مُنُذُ سَمِعُتُ رَسُوُلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنُهَا ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۳۳ میں 'فَقَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهِ بَعُدَ ذٰلِكَ ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۷۶۶ میں 'فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهَا بَعُدُ ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۹۴ میں 'قَالَ عُمَرُ فَمَا حَلَفُتُ بِهَا ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۱۲ میں 'قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهَا مُنُذُ سَمِعُتُ رَسُوُلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنُهَا وَلَا تَكَلَّمُتُ بِهَا ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۴۵۲۳ میں 'قَالَ عُمَرُ فَمَا حَلَفُتُ بِهَا بَعُدُ ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۴۵۴۸ میں 'قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ فَوَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهَا ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۰۶ میں 'قَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنُهُ وَاللّٰهِ مَا حَلَفُتُ بِهَا بَعُدُ ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

ابن ماجہ، رقم ۲۱۰۱ میں 'مَنُ حَلَفَ بِاللّٰهِ فَلُيَصُدُقُ وَمَنُ حُلِفَ لَهُ بِاللّٰهِ فَلُيَرُضَ وَمَنُ لَمُ يَرُضَ بِاللّٰهِ فَلَيُسَ مِنَ اللّٰهِ' کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بیہقی، رقم ۲۰۵۱۲ میں یہی بات 'مَنْ حَلَفَ بِاللّٰہِ فَلْیَصْدُقْ وَمَنْ حُلِفَ لَہُ بِاللّٰہِ فَلْیَرْضَ وَمَنْ حُلِفَ لَہُ بِاللّٰہِ فَلَمْ یَرْضَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

۲۔ 'فِیْ غَزَاۃٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ' کے الفاظ احمد بن حنبل، رقم ۲۹۱ سے لیے گئے ہیں۔

۳۔ 'وَھُوَ یَقُوْلُ وَأَبِیْ وَأَبِیْ' کے الفاظ نسائی، رقم ۳۷۶۶ سے لیے گئے ہیں۔

۴۔ 'وَکَانَتْ قُرَیْشٌ تَحْلِفُ بِآبَائِھَا' کے الفاظ مسلم، رقم ۱۶۴۶ سے لیے گئے ہیں۔

۵۔ 'فَنَادَاھُمْ' کے الفاظ بخاری، رقم ۵۷۵۷ سے لیے گئے ہیں۔

۶۔ 'أَلَا' کا لفظ بخاری، رقم ۳۶۲۴ سے لیا گیا ہے۔

۷۔ 'لَوْ أَنَّ أَحَدَکُمْ حَلَفَ بِالْمَسِیْحِ ھَلَکَ وَالْمَسِیْحُ خَیْرٌ مِّنْ آبَائِکُمْ' کے الفاظ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۸ سے لیے گئے ہیں۔

۸۔ 'قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰہِ مَا حَلَفْتُ بِھَا مُنْذُ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاکِرًا وَلَا آثِرًا' کے الفاظ بخاری، رقم ۶۲۷۱ سے لیے گئے ہیں۔

یہ مضمون مسلم، رقم ۱۶۴۸ اور ابن ماجہ، رقم ۲۰۹۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

لا تحلفوا بالطواغی و لا بآبائکم. ''نہ باطل معبودوں کی قسمیں کھاؤ اور نہ آبا و اجداد کی۔''

یہ مضمون نسائی، رقم ۳۷۷۴؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۷۷؛ بیہقی، رقم ۱۹۶۱۲ میں اور احمد بن حنبل، رقم ۲۰۶۴۳ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

لا تحلفوا بآبائکم و لا بالطواغیت. ''نہ آبا و اجداد کی قسمیں کھاؤ اور نہ باطل معبودوں کی۔''

یہ مضمون ابوداؤد، رقم ۳۲۴۸؛ بیہقی، رقم ۱۹۶۱۳؛ ابن حبان، رقم ۴۳۵۷ اور نسائی، رقم ۳۷۶۹ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

لا تحلفوا بآبائکم و لا بأمھاتکم و لا بالأنداد و لا تحلفوا إلا باللّٰہ و لا ''نہ اپنے آبا و اجداد کی قسمیں کھاؤ، نہ اپنی ماؤں کی اور نہ خدا کے مزعومہ شرکا کی۔ خدا کے سوا کسی کی بھی قسم

تحلفوا باللّٰه إلا و أنتم صادقون.
نہ کھاؤ اور خدا کی قسم بھی تب کھاؤ جب تم سچے ہو۔‘‘

یہ مضمون ابویعلیٰ، رقم ۶۰۴۸ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

لا تحلفوا بآبائكم و لا بأمهاتكم و لا بالأنداد و لا تحلفوا باللّٰه إلا و أنتم صادقون.

’’نہ اپنے آبا و اجداد کی قسمیں کھاؤ، نہ اپنی ماؤں کی اور نہ خدا کے مزعومہ شرکا کی اور خدا کی قسم بھی تبھی کھاؤ جب تم سچے ہو۔‘‘

یہ مضمون احمد بن حنبل، رقم ۳۲۹ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

قال (عمر) لا و أبی فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم مه إنه من حلف بشیء دون اللّٰه فقد أشرك.

’’عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں ’میرے باپ کی قسم‘ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رکو، جس نے بھی خدا کے علاوہ کسی کی قسم کھائی، اس نے شرک کیا۔‘‘

یہ مضمون احمد بن حنبل، رقم ۴۹۰۴ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

كان عمر يحلف و أبی فنهاه النبی صلی اللّٰه علیه و سلم قال من حلف بشیء دون اللّٰه تعالٰی فقد أشرك (وقال الآخر) وهو شرك.

’’عمر رضی اللہ عنہ ’و أبی‘ کے الفاظ سے قسم کھایا کرتے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس سے منع کیا۔ آپ نے فرمایا: جس نے اللہ کے علاوہ کسی چیز کی قسم کھائی، اس نے شرک کیا۔ (دوسرا راوی کہتا ہے) اور وہ (قسم) شرک ہوگی۔‘‘

یہ مضمون ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۲۸۰ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

كنا مع عمر فی حلقة فسمع رجلاً يقول لا و أبی فرماه بالحصا وقال إنها كانت يمينی فنهاه النبی صلی اللّٰه علیه و سلم عنها وقال إنها شرك.

’’ہم عمر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ایک حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے ایک آدمی کو ’لا و أبی‘ کے الفاظ کہتے ہوئے سنا تو آپ نے اس کی طرف کنکریاں پھینکیں اور کہا: ان الفاظ کے ساتھ میں قسم کھاتا تھا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس سے منع کر دیا اور آپ نے فرمایا: بے شک، یہ شرک ہے۔‘‘

یہ مضمون احمد بن حنبل، رقم ۵۳۴۶ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من حلف بغیر اللّٰه فقال فیه قولاً شدیدًا.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھائی، (راوی کہتا ہے کہ) آپ نے اس کے بارے میں ایک شدید بات فرمائی۔“

یہ مضمون احمد بن حنبل، رقم ۵۳۷۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

عن سعد بن عبیدة قال جلست أنا ومحمد الکندی إلی عبد اللّٰه بن عمر ثم قمت من عنده فجلست إلی سعید بن المسیب قال فجاء صاحبی وقد اصفر وجهه وتغیر لونه فقال قم إلی قلت ألم أکن جالسًا معك الساعة فقال سعید قم إلی صاحبك قال فقمت إلیه فقال ألم تسمع إلی ما قال بن عمر قلت وما قال قال أتاه رجل فقال یا أبا عبد الرحمٰن أعلی جناح ان أحلف بالکعبة قال ولم تحلف بالکعبة إذا حلفت بالکعبة فاحلف برب الکعبة فإن عمر کان إذا حلف قال کلا وأبی فحلف بها یومًا عند رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لا تحلف بأبیك ولا بغیر اللّٰه فإنه من حلف بغیر اللّٰه فقد أشرك.

”سعد بن عبیدہ سے روایت ہے کہ میں اور محمد الکندی عبداللہ بن عمر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر میں آپ کے پاس سے اٹھا اور سعید ابن مسیّب کے پاس جا بیٹھا، وہ بتاتے ہیں کہ پھر میرا ساتھی میرے پاس آیا، اس کا چہرہ زرد تھا اور اس کا رنگ اڑا ہوا تھا، اس نے کہا: میرے پاس آؤ، میں نے کہا: ابھی تو میں تمھارے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، سعید بن مسیّب نے کہا: اپنے ساتھی کے پاس جاؤ۔ وہ کہتے ہیں: پھر میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا، اس نے مجھ سے پوچھا: کیا تو نے سنا ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے؟ میں نے پوچھا کہ انھوں نے کیا کہا ہے؟ اس نے بتایا کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا: اے ابوعبدالرحمٰن، کیا مجھے کوئی گناہ ہوگا اگر میں کعبہ کی قسم کھاتا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ کعبہ کی قسم نہ کھاؤ، اور جب کعبہ کی قسم کھانی ہی ہو تو رب کعبہ کی قسم کھایا کرو، عمر رضی اللہ عنہ جب قسم کھاتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ’ہرگز نہیں میرے باپ کی قسم‘، انھوں نے ایک دن یہی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کھائی، آپ نے فرمایا: اپنے باپ کی قسم نہ کھاؤ اور نہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھایا کرو، کیونکہ جس نے بھی اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائی، اس نے یقیناً شرک کیا۔“

یہ مضمون بیہقی، رقم ۱۹۶۱۵اور احمد بن حنبل، رقم ۵۵۹۳ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

عن سعد بن عبيدة قال كنت عند عبد اللّٰه بن عمر رضى الله عنهما فقمت وتركت رجلاً عنده من كندة فأتيت سعيد بن المسيب قال فجاء الكندى فزعًا فقال جاء ابن عمر رجل فقال احلف بالكعبة قال لا ولكن أحلف برب الكعبة فإن عمر كان يحلف بأبيه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تحلف بأبيك فإنه من حلف بغير اللّٰه فقد أشرك.

''سعد بن عبیدہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں (اپنے ایک کندی ساتھی کے ساتھ) عبداللہ ابن عمر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے اٹھا، اپنے کندی ساتھی کو ان کے پاس ہی چھوڑا اور خود سعید بن مسیّب کے حلقے میں آ بیٹھا، وہ بتاتے ہیں کہ پھر وہ کندی گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ عبداللہ ابن عمر کے پاس ابھی ایک آدمی آیا تھا اور اس نے کہا: میں کعبہ کی قسم کھاتا ہوں۔ عبداللہ ابن عمر نے کہا: نہیں، تم کہو کہ میں رب کعبہ کی قسم کھاتا ہوں، کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرتے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کہا تھا کہ اپنے باپ کی قسم نہ کھاؤ، کیونکہ جس کسی نے بھی اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائی، اس نے یقیناً شرک کیا۔''

یہ مضمون احمد بن حنبل، رقم ۵۲۲۲ اور ۵۲۵۶ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

عن سعد بن عبيدة قال كنت مع ابن عمر فى حلقة قال فسمع رجلاً فى حلقة أخرى وهو يقول لا وأبى فرماه بن عمر بالحصى فقال انها كانت يمين عمر فنهاه النبى صلى اللّٰه عليه وسلم عنها وقال انها شرك.

''سعد بن عبیدہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ ابن عمر کے حلقے میں بیٹھا ہوا تھا، (اتنے میں) انھوں نے ایک دوسرے حلقے میں بیٹھے ہوئے آدمی کو 'نہیں، میرے باپ کی قسم' کے الفاظ کہتے ہوئے سنا تو انھوں نے اس کی طرف کنکریاں پھینکیں۔ پھر انھوں نے بتایا کہ یہ عمر رضی اللہ عنہ کی قسم ہوا کرتی تھی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس سے روک دیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ یہ شرک ہے۔''

یہ مضمون ترمذی، رقم ۱۵۳۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

عن سعد بن عبيدة أن ابن عمر سمع رجلاً يقول لا والكعبة فقال ابن عمر لا يحلف بغير اللّٰه فإني سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول من حلف بغير الله فقد كفر أو أشرك.	''سعد بن عبیدہ سے روایت ہے کہ ابن عمر نے ایک آدمی کو 'نہیں، کعبہ کی قسم' کے الفاظ کہتے ہوئے سنا تو انھوں نے کہا کہ وہ غیر اللہ کی قسم نہ کھائے، کیونکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے یقیناً کفر کیا یا شرک کیا۔''

یہی مضمون کچھ فرق کے ساتھ ابوداؤد، رقم ۳۲۵۱؛ احمد بن حنبل، رقم ۶۰۷۲؛ بیہقی، رقم ۱۹۶۱۴ میں بھی بیان ہوا ہے:

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۵۱ میں 'أَنَّ ابْنَ عُمَرَ سَمِعَ' کے بجائے 'سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ' کے الفاظ اور 'فَإِنِّي' کے بجائے 'إِنِّي' کے الفاظ اور 'كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ' کے بجائے 'أَشْرَكَ' کے الفاظ اور بعض روایات، مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۰۷۲ میں 'لَا وَالْكَعْبَةِ' کے بجائے 'وَالْكَعْبَةِ' کے الفاظ اور 'لَا يَحْلِفُ' کے بجائے 'لَا تَحْلِفُ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

یہ مضمون ابن حبان، رقم ۴۳۵۸ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

عن سعد بن عبيدة قال كنت عند ابن عمر فحلف رجل بالكعبة فقال ابن عمر ويحك لا تفعل فإني سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول من حلف بغير الله فقد أشرك.	''سعد بن عبیدہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں ابن عمر کے پاس تھا، اتنے میں ایک آدمی نے کعبہ کی قسم کھائی تو ابن عمر نے اس سے کہا: تیرا ناس ہو، ایسا نہ کر، کیونکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے یقیناً شرک کیا۔''

محمد عمار خان ناصر

قذف کی سزا

[یہ مصنف کی زیر طبع کتاب ''حدود و تعزیرات ــــ چند اہم مباحث'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث بالاقساط شائع کیے جا رہے ہیں۔]

قرآن مجید میں قذف کی سزا سورۂ نور (۲۴) کی آیات ۴-۵ میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

''اور جو لوگ پاک دامن خواتین پر الزام لگائیں، پھر اس پر چار گواہ پیش نہ کر سکیں، انھیں اسی کوڑے لگاؤ اور (کسی معاملے میں) ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ اور یہی لوگ فاسق ہیں۔ ہاں، جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔''

اس سزا کے حوالے سے کئی فقہی بحثیں تنقیح کا تقاضا کرتی ہیں۔

توبہ و اصلاح کے بعد قاذف کی گواہی کا حکم

ایک بحث یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں 'اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا' کا استثنا 'اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ' سے متعلق ہے یا 'لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا' سے۔ دوسری تاویل ماننے کی صورت میں اس بات کی گنجایش پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر قذف کا مرتکب توبہ و اصلاح کر لے تو اس کی گواہی قابل قبول قرار دے دی جائے، تاہم احناف نے اسے فسق سے متعلق مانا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ دنیا میں قذف کے مرتکب کی گواہی قبول کرنے کی کسی حال میں کوئی گنجایش نہیں۔

ہماری رائے میں کلام میں تین قرینے ایسے ہیں جو احناف کی رائے کو راجح قرار دیتے ہیں:

ایک یہ کہ 'لَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا ' میں 'اَبَدًا' کی قید از روے بلاغت اس کے بعد کسی استدراک کی گنجایش ماننے میں مانع ہے۔ اگر قرآن مجید کو یہ کہنا ہوتا کہ توبہ کے بعد ان کی گواہی قبول کر لی جائے تو اصل حکم میں 'اَبَدًا' کی قید کا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

دوسرے یہ کہ 'اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ' میں توبہ کا جو اثر اور نتیجہ بیان کیا گیا ہے، وہ دنیوی سزا سے نہیں، بلکہ اخروی سزا سے متعلق ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ پورا استدراک دراصل 'اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ' کے ساتھ متعلق ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر اس استدراک کو ردشہادت سے متعلق مانا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توبہ و اصلاح کے متحقق ہو جانے کا فیصلہ ظاہر میں کیسے کیا جائے گا؟ اگر تو یہ فرض کیا جائے کہ قذف کا ارتکاب کرنے والے افراد لازماً ایسے ہوں گے جو اپنی ظاہری زندگی میں فسق و فجور میں معروف ہوں تو ان کی توبہ و اصلاح کا کسی حد تک اندازہ ان کے ظاہری طرز زندگی میں تبدیلی سے کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے قذف کی سزا صرف ایسے افراد کے لیے بیان نہیں کی، بلکہ بظاہر بہت قابل اعتماد اور متقی افراد بھی اگر کسی پر زنا کا الزام لگائیں اور چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کے لیے بھی یہی سزا ہے۔ ایسے افراد کے ہاں توبہ اور اصلاح کا ظہور، ظاہر ہے کہ ان کے باطن میں ہوگا جس کا فیصلہ کرنے کا کوئی ظاہری معیار موجود نہیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ ایسے لوگ اگر توبہ و اصلاح کر لیں تو ان کی گواہی قبول کر لی جائے، عملی اعتبار سے ایک بے معنی بات قرار پاتی ہے۔

غیر مسلموں پر زنا کا الزام لگانے کی سزا

قذف سے متعلق مذکورہ آیات میں 'وَالَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر محصن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگانے کی صورت میں قاذف کو یہ سزا نہیں دی جائے گی۔ جمہور فقہا نے کسی شخص کے محصن ہونے کی شرائط میں مسلمان ہونے کو بھی شمار کیا ہے۔ چنانچہ وہ کسی غیر مسلم پر زنا کا الزام

---

[1] فنی اعتبار سے یہاں 'اِلَّا' استثنا کا نہیں، بلکہ استدراک کا 'اِلَّا' ہے اور ہم نے ترجمے میں اس کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ ناقصہ نہیں، بلکہ جملہ تامہ آیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے استعمال کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ (دیکھیے: سورۂ جن ۷۲: ۲۷۔ سورۂ غاشیہ ۸۸: ۲۳-۲۴)

لگانے کی صورت میں مسلمان قاذف پر حد جاری کرنے کے قائل نہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک اگر مسلمان شوہر اپنی غیر مسلم بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو دونوں کے مابین لعان نہیں کرایا جائے گا۔ فقہا نے 'احصان' کے اس مفہوم کے لیے بالعموم عبد اللہ بن عمر سے مروی بعض روایات کو ماخذ قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس سعید بن المسیب کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اہل کتاب کی خواتین پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے تو اسے بھی کوڑے لگائے جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی 'محصنات' قرار دیا ہے[2]۔ سیدنا عمر کے بارے میں بھی نقل ہوا ہے کہ وہ اہل ذمہ کی خواتین پر زنا کا الزام لگانے والے کو کوڑے لگایا کرتے تھے[3]۔ تاہم اس میں صراحت نہیں کہ یہ حد کے کوڑے ہوتے تھے یا تعزیر کے۔ اسی طرح بعض فقہا مسلمان شوہر کے اپنی غیر مسلم بیوی پر زنا کا الزام لگانے کی صورت میں ان کے مابین لعان کے بھی قائل ہیں[4]۔

ہماری رائے میں موخر الذکر رائے زیادہ وزن رکھتی ہے، اس لیے کہ قرآن مجید نے قذف کی سزا کے بیان میں 'محصنات' کا لفظ پاک دامن عورتوں کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جو اس لفظ کا عام اور معروف استعمال ہے۔ یہ بات کہ احصان کا کوئی مخصوص اصطلاحی مفہوم ہے جس میں مسلمان ہونا بھی شامل ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر کوئی مضبوط دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ اگر شریعت نے اس کو کوئی خاص اصطلاح بنایا ہے اور اس میں بعض اوصاف و قیود کا اضافہ کیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے واضح اور صریح دلائل چاہییں جو میسر نہیں۔ اس ضمن میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کے بارے میں اول تو یہی بات طے نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا عبد اللہ بن عمر کا فتویٰ[5]۔ بظاہر دوسرے امکان کے حق میں زیادہ قرائن پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس قول میں بھی 'احصان' کا کوئی اصطلاحی مفہوم بیان کرنا متکلم کے پیش نظر نہیں۔ یہ صحابی کی طرف سے ایک تاثر اور احساس کا بیان ہے جو سراسر ایک موضوعی (Subjective) چیز ہے اور جسے زبان کے معروف و متداول الفاظ کے معانی متعین کرنے کے لیے کسی طرح بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اب جہاں تک لفظ کے سادہ مفہوم کے لحاظ سے پاک دامن ہونے کا تعلق ہے تو قرآن مجید ہی کی تصریح سے یہ بھی واضح ہے کہ پاک دامن عورتیں جیسے مسلمانوں میں ہو سکتی ہیں، اسی طرح غیر مسلموں میں بھی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۵ میں اہل کتاب کی خواتین سے نکاح کی اجازت بیان کرتے ہوئے 'وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ' (اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

البتہ، فقہا کے موقف کی ایک دوسری اساس موجود ہے اور اپنے محل میں ان کی بات درست ہے۔ ہم نے ''قصاص و دیت میں مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز'' کے تحت واضح کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت

کے بعد اسلام قبول نہ کرنے والے اہل کتاب کے لیے قرآن مجید میں یہ سزا مقرر کی گئی تھی کہ انھیں محکوم بنا کر ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے اور وہ مسلمانوں کے زیردست بن کر ذلت کے ساتھ زندہ رہیں[6]۔ اس عمومی رہنمائی کی روشنی میں صحابہ نے مسلمانوں کے محکوم بننے والے ان غیر مسلموں کے لیے بہت سے امتیازی قوانین وضع کیے جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے معاشرتی مرتبے اور تکریم کے لحاظ سے مسلمانوں کے مساوی نہ سمجھے جائیں اور انھیں تذلیل وتحقیر کا احساس ہوتا رہے۔ غیر مسلم پر زنا کا الزام لگانے کی صورت میں مسلمان پر حد قذف جاری نہ کرنے کی رائے بھی اسی نکتے پر مبنی ہے۔ ''ارتداد کی سزا'' کے تحت ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنے اور انھیں تحقیر وتذلیل کا نشانہ بنانے کی یہ سزا اپنے پس منظر کے لحاظ سے شریعت کا کوئی عمومی قانون نہیں تھی۔ اس کا تعلق انھی غیر مسلموں سے تھا جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نیابت میں صحابہ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ سزا نافذ کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس دائرے سے باہر اس حکم کی تعمیم حکم کی علت کی رو سے درست نہیں اور اگر قذف کا قانون عزت وآبرو کے تحفظ کے لیے ہے تو اسلامی ریاست کے مسلمان شہریوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو بھی اس حق سے بہرہ مند کیا جانا چاہیے۔

جدید طبی ذرائع اور لعان

مذکورہ آیات میں قرآن مجید نے کسی پاک دامن عورت پر زنا کا الزام ثابت کرنے کے لیے چار گواہ طلب کیے ہیں اور اگر الزام لگانے والا گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے قذف کی پاداش میں ۸۰ کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے، البتہ ان سے متصل اگلی آیات میں شوہر کے لیے یہ قانون بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں تو میاں بیوی کے مابین لعان کرایا جائے گا[7]۔

شوہر کے لیے یہ گنجایش پیدا کرنے کی وجہ بالکل واضح ہے کہ اگر وہ اپنے الزام میں سچا ہے، لیکن چار گواہ پیش نہیں کر سکا تو اسے جھوٹا قرار دے کر قذف کی سزا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت جس بچے کو جنم دے گی، اس کا نسب اس کے شوہر ہی سے ثابت مانا جائے گا، جبکہ یہ امکان موجود ہے کہ بچہ درحقیقت اس کا نہ ہو۔ اگر بچے کے نسب کا مسئلہ نہ ہو تو لعان کے اس طریقے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی اور خاوند سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کی

۲؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۲۵۰۷۔

۳؎ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۹۲۹۔

۴؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۲۵۰۳-۱۲۵۰۵۔

عورت بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے تو وہ طلاق دے کر اسے فارغ کر دے، لیکن چونکہ یہاں اصل مسئلہ بچے کے نسب کے ثبوت کا ہے اور شوہر کا یہ حق ہے کہ کسی ناجائز بچے کی نسبت اس کی طرف نہ کی جائے، اس لیے بچے کا نسبی تعلق اس سے ختم کرنے کے لیے لعان کی مذکورہ صورت نکالی گئی، تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ امکان بھی پوری طرح موجود ہے کہ شوہر اپنے الزام میں جھوٹا ہو اور اپنی بیوی کو بدنام کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی ہی اولاد کو بھی نسبی شناخت کے جائز حق سے محروم کرنے کے دوہرے جرم کا مرتکب ہوا ہو۔ قدیم دور میں بچے کے نسب کی تحقیق کا کوئی یقینی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ چنانچہ لعان کے سوا اس معاملے کا کوئی حل ممکن نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی پر الزام لگانے کی صورت میں لعان کا یہ طریقہ اختیار کر کے بچے کے نسب کو عورت کے شوہر سے منقطع کرنا بجائے خود مقصود نہیں، بلکہ ایک عملی مجبوری کا نتیجہ تھا۔ ہماری یہ راے اگر درست ہے تو دور جدید میں طبی ذرائع کے ارتقا کے حوالے سے اس پر دو نتیجے مرتب ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اگر خاوند کے بیوی پر الزام لگانے کی صورت میں بیوی لعان کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے طبی ذرائع کی مدد سے الزام کی تحقیق کا مطالبہ کرے تو ایسا کرنا ضروری ہوگا، اس لیے کہ لعان کی صورت میں بیوی زنا کی سزا سے تو

۵؎ عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس مفہوم کی ایک روایت ان کے شاگرد نافع نے 'من اشرك بالله فليس بمحصن' یعنی ''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، وہ ''محصن'' نہیں ہے۔'' کے الفاظ میں نقل کی ہے۔ (دار قطنی ۳/۱۴۷۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۷۱۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۷۵۴، ۵/۵۳۶) تمام رواۃ اسے ابن عمر کے قول ہی کے طور پر روایت کرتے ہیں، البتہ ایک راوی اسحاق بن ابراہیم الحنظلی النیسابوری نے اسے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ دار قطنی لکھتے ہیں کہ اسحاق کے علاوہ کسی نے اسے مرفوع نہیں کیا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اس سے رجوع کر لیا تھا، اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ یہ موقوف ہے۔ (دار قطنی ۳/۱۴۶)

ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے یہ قول ان الفاظ سے بھی مروی ہے: 'لا يحصن اهل الشرك بالله شيئًا' (دار قطنی ۳/۱۴۶) یعنی ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والا ''محصن'' نہیں ہو سکتا۔'' اس قول کو بھی سفیان ثوری کے شاگرد عفیف بن سالم نے مرفوعاً روایت کیا ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ عفیف کو وہم لاحق ہوا ہے اور درست بات یہ ہے کہ یہ ابن عمر کا قول ہے۔ (دار قطنی ۳/۱۴۶) امام دار قطنی کے علاوہ حافظ ابن حجر اور علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی ان آثار کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ (فیض الباری ۵/۲۲۹)

بچ جاتی ہے، لیکن معاشرے کی نظر میں اس کی عفت وعصمت مشتبہ اور کردار مشکوک قرار پاتا ہے۔ لعان کا طریقہ، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، بذات خود مطلوب نہیں، جبکہ اپنی حیثیت عرفی کا تحفظ خاتون کا ایک جائز حق ہے۔ چنانچہ طبی ذرائع اگر خاوند کے الزام کی تحقیق میں کوئی قابل اعتماد معاونت فراہم کر سکتے ہیں تو ان سے مدد لینا ضروری ہوگا۔ البتہ اگر طبی ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات فیصلہ کن نہ ہوں تو وہ مجبوری علیٰ حالہ باقی رہتی ہے جس کے پیش نظر لعان کا طریقہ مشروع کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر طبی ذرائع سے بچے کے نسب کی تحقیق یقینی طور پر ممکن ہے اور اپنے نسب کا تحفظ بجائے خود بچے کا ایک جائز حق بھی ہے تو بیوی کے کہنے پر یا بڑا ہونے کے بعد خود بچے کے مطالبے پر ان ذرائع سے مدد لینا اور اگر ان کی رو سے بچے کا نسب اپنے باپ سے ثابت قرار پائے تو اسے قانونی لحاظ سے اس کا جائز بیٹا تسلیم کرنا، ہر لحاظ سے شریعت کے منشا کے مطابق ہوگا۔

خاوند کے بدکار ہونے کی صورت میں فسخ نکاح کا حق

یہاں ایک مزید بحث یہ ہے کہ قرآن مجید نے لعان کا طریقہ اصلاً اس صورت کے لیے بیان کیا ہے جب شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے۔ اگر بیوی شوہر پر زنا کا الزام عائد کرے اور اس بنیاد پر اس سے تفریق کا مطالبہ کرے تو کیا کیا جائے؟ نصوص میں اس صورت کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ فقہی ذخیرے میں بھی ہمیں اس صورت سے متعلق کوئی تصریح نہیں مل سکی، لیکن فقہا غالباً اس صورت کو بھی قذف سے متعلق نصوص کے عموم کے تحت داخل مانتے اور بیوی پر قذف کی حد جاری کرنے کے قائل ہیں۔ ہماری رائے میں یہ امر بحث طلب ہے،

اس لیے کہ جس نوعیت کی مجبوری کے تحت خاوند کو قذف کے عمومی قانون سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے لعان کا طریقہ تجویز کیا گیا ہے، کم وبیش اسی درجے کی مجبوری اس صورت میں عورت کو بھی پیش آتی ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف نکاح کے لیے پاک دامن مردوں اور عورتوں کے انتخاب کی بار بار تاکید کی ہے، بلکہ متعین طور پر یہ بھی فرمایا ہے کہ جس مرد یا عورت کا زانی ہونا ثابت ہو جائے، اس سے کوئی پاک دامن عورت یا مرد نکاح نہیں کر سکتے۔

ارشاد باری ہے:

۶؎ التوبہ ۹: ۲۹۔

۷؎ النور ۲۴: ۴-۹۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ. (النور ۲۴:۳)

''زانی مرد کسی عورت سے نکاح نہ کرنے پائے، سوائے اس کے کہ کوئی زانیہ ہو یا مشرکہ۔ اور زانیہ سے بھی کوئی شخص نکاح نہ کرے، سوائے اس کے کہ کوئی زانی ہو یا مشرک، جبکہ اہل ایمان پر ایسا کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔''

جمہور فقہا 'حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ' کو زنا کی حرمت کا بیان قرار دیتے ہیں، لیکن یہاں نہ تو اصولی طور پر زنا کی حرمت بیان کرنے کا کوئی محل ہے اور نہ 'اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ' کا سابق جملہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ 'حُرِّمَ ذٰلِکَ' کو نکاح کے بجائے زنا کی حرمت کا بیان سمجھا جائے، اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ اس آیت سے زانی مرد یا زانی عورت کے ساتھ نکاح کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ کتب حدیث میں منقول ایک روایت کے مطابق، جس کی سند کچھ کمزور ہے، جب مرثد بن ابی مرثد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک زانی عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت مانگی تو آپ نے اسے یہی آیت پڑھ کر سنائی اور فرمایا کہ اس کے ساتھ نکاح نہ کرو۔[۸]

بالفرض اس کو حرام نہ مانا جائے تو بھی عام اخلاقیات اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جس طرح مرد کو یہ حق ہے کہ وہ بدچلن عورت کو اپنے نکاح میں نہ رکھے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ کسی بدکردار مرد کے نکاح میں نہ رہے۔ اس لحاظ سے اگر بیوی اس بنیاد پر اپنے خاوند سے جدائی کا دعویٰ عدالت میں کرے کہ وہ ایک بدکار شخص ہے تو اس سے چار گواہ طلب کرنا جو ایک ناممکن بات ہے، اور ایسا نہ کر سکنے کی صورت میں اس پر قذف کی حد جاری کرنا عدل وانصاف کے منافی دکھائی دیتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہوگا کہ یا تو اس صورت میں بھی لعان کے بعد دونوں میں تفریق کرا دی جائے یا عورت پر حد قذف جاری کیے بغیر اسے فسخ نکاح کی سہولت دے دی جائے۔

حد قذف کے نفاذ کے مطالبہ کا حق

فقہاے احناف نے قذف کو ناقابل دست اندازیِ پولیس جرم قرار دیا ہے اور ان کی رائے میں جب تک کوئی صاحب حق خود مرافعہ نہ کرے، عدالت از خود قاذف کو سزا دینے کا اختیار نہیں رکھتی۔ ہماری رائے میں یہ بات بنیادی طور پر درست ہے، تاہم بعض صورتیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ تقاضا کرتی ہیں کہ ان میں خود نظم اجتماعی کو اقدام

---

۸ ترمذی، رقم ۳۱۰۱۔ نسائی، رقم ۳۱۷۶۔

کرنے کا حق دیا جائے۔

مثال کے طور پر اگر الزام کا نشانہ بننے والا فرد کسی دباؤ یا جبر کے تحت یا مجرم کے معاشرتی اثر ورسوخ سے خوف زدہ ہو کر اپنے حق دفاع کو استعمال کرنے سے گریز کرے تو عدالت اس کے تحفظ کے لیے از خود نوٹس لے سکتی ہے۔ اسی طرح معاشرے کی ایسی سربرآوردہ اور قدآور شخصیات جو معاشرے کی شناخت کا ذریعہ ہوں اور ان کی ہتک عزت سے پورا معاشرہ اذیت محسوس کرے، ان کی حیثیت عرفی کو قومی اثاثہ سمجھنا چاہیے اور اگر شرپسند عناصر ان کی شخصیت کو داغ دار کرنا چاہیں تو ریاست کو مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے خلاف اقدام کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

اگر الزام تراشی اور بہتان طرازی انفرادی اور شخصی دائرے سے نکل کر کسی معاشرتی فتنے کی صورت اختیار کر لے تو بھی قانون اور عدالت کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ چنانچہ سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۶۱ میں منافقین اور مدینہ منورہ میں فتنہ انگیزی کرنے والے بعض دوسرے گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ باز نہیں آئیں گے تو انھیں جہاں پائے جائیں، عبرت ناک طریقے سے قتل کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔ آیت کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ مدینہ منورہ کے ان فتنہ پرداز گروہوں کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اہل بیت اور مسلمان خواتین کے بارے میں بہتان تراشنے اور ان کی کردار کشی کے مکروہ عمل نے ایک باقاعدہ اور منظم مہم کی شکل اختیار کر لی تھی اور اسی سے نمٹنے کے لیے یہاں ان کے خلاف سخت کارروائی کی دھمکی دی گئی ہے۔

اسی طرح اگر کسی خاتون پر زنا کا الزام عائد کیا جائے اور وہ خود تو حد قذف کا مطالبہ نہ کرے، لیکن اس کے اعزہ قاذف کے خلاف مرافعہ کریں تو ہماری راے میں ان کا یہ حق تسلیم کیا جانا چاہیے، اس لیے کہ خواتین کی عزت ان کے اعزہ واقربا اور اہل خاندان کی بھی عزت ہوتی ہے اور انھیں بھی اسی طرح اذیت کا شکار ہونا پڑتا ہے جس طرح خاتون ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مکرمہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والے افراد پر خود ام المومنین کے مطالبے پر نہیں، بلکہ ریاست ہی کی طرف سے اقدام کرتے ہوئے حد قذف جاری کی گئی تھی۔ فقہا کا ایک گروہ ایسی صورت میں جب الزام کا نشانہ بننے والی عورت خود تو محصنہ نہ ہو، لیکن اس کا شوہر یا بیٹا محصن ہو، قاذف پر حد جاری کرنے کے قائل ہیں[9]۔ ہماری راے میں اسی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ان اعزہ کو اجراے حد کا مطالبہ کرنے کا حق بھی حاصل ہو اور اس حق کو قذف کا نشانہ بننے والے مرد یا عورت کی زندگی تک محدود نہ مانا جائے، بلکہ اس کے بعد بھی اقربا کے لیے یہ حق تسلیم کیا جائے۔ حنفی فقہا نے اس حق کو ان حقوق میں شمار کیا ہے جو ورثا کو منتقل نہیں ہوتے، حالانکہ اسے وراثت کے ساتھ منسلک کرنے کے بجاے مذکورہ سادہ اصول پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر

مقذوف کی زندگی میں اس پر الزام لگایا جائے اور وہ فوت ہو جائے تو یہ کہہ کر ورثا کو حق مرافعہ سے محروم کرنا درست نہیں کہ حق قذف میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔ یہ وراثت کا نہیں، بلکہ عزت و آبرو کے تحفظ کا مسئلہ ہے جو ورثا کے لیے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی مرنے والے کے لیے رکھتا تھا۔

---

۹ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۲۱۲-۲۸۲۱۵۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۷۸۱-۱۳۷۸۲۔

خالد مسعود

اہل کتاب پر تنقید

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نضر بن حارث کی تحریک سے یہود مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نقصان پہنچانے کی جو کوششیں کیں ان کا تذکرہ تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ان کے القا کیے ہوئے سوالات اور اعتراضات کے جوابات قرآن میں ایسے انداز سے آئے کہ وہ صحیح حقائق کو بھی سامنے لائیں، اہل کتاب کے لیے سبق آموز بھی ہوں اور قریش بھی ان کی مدد سے اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو کر سکیں۔

اس عمل میں یہ بھی ضروری ہو گیا کہ مکی دور ہی میں اہل کتاب کو ایک حد تک دین کی دعوت کے لیے مخاطب بھی کر لیا جائے تا کہ ان کے باصلاحیت لوگ اس کی جانب جھکیں اور ہدایت قبول کریں۔ اہل کتاب میں نصاریٰ اور یہود دونوں شامل تھے، لہٰذا ان دونوں کو اشارات و کنایات میں ضمناً مخاطب کیا گیا۔ اصل خطاب قریش ہی کی طرف رہا کیونکہ اصلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انھی کی جانب ہوئی تھی۔

اچھے اہل کتاب کا رویہ

قرآن مجید کے بارے میں تمام اہل کتاب کا رویہ یکساں نہیں تھا۔ اگرچہ مجموعی طور پر مخالفین ہی کی اکثریت تھی لیکن اچھے اہل کتاب کے ہاں انانیت، ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ نہیں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے جگہ جگہ ان کے طرز عمل کی تحسین کی اور توجہ دلائی کہ قرآن مجید کی ہر بات ان کو اپنے دل کی بات نظر آتی ہے اور وہ والہانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ اس کے اندر وہی خوشبو پاتے ہیں جس کا تجربہ ان کو اپنی کتاب پڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ جب قرآن کی آیات کو سنتے ہیں تو ان سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ گریہ مسرت اور گریہ خشوع کی دوہری کیفیت

ان پر طاری ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان کے صحیفوں میں ایک عظیم رسول کی آمد اور اس کے واسطہ سے کامل آسمانی کتاب کے نزول کی خبر موجود ہے، لہٰذا وہ منتظر و مشتاق رہے ہیں کہ کب وہ عظیم رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اب وہ اس رسول اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں ان پیشین گوئیوں کا مصداق پا رہے ہیں، جن پر پہلے سے ان کا ایمان رہا ہے۔

قرآن مجید نے ان اہل کتاب کی بار بار تحسین فرمائی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:

بَل هُوَ ايٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ. وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ. (العنکبوت ۲۹: ۴۹)

''بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور ہماری آیات کا بس وہی لوگ انکار کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔''

سورہ رعد میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَه'. (الرعد ۱۳: ۳۶)

''اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور ان جماعتوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں۔''

سورہ انعام میں ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَه' كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (الانعام ۶: ۲۰)

''جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔''

یہی مضمون سورہ قصص کی آیات ۵۲ تا ۵۵ میں بھی ہے۔ وہاں ان اہل کتاب کی سلامت روی کا صلہ دوہرے اجر کی صورت میں دینے کا وعدہ فرمایا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے پہلے دین پر بھی استقامت دکھائی اور جب آخری پیغمبر کا ظہور ہوا تو ان کو پہچاننے میں بھی دیر نہیں کی۔

اچھے اہل کتاب کے اس رویہ میں قریش کے لیے ایک سبق پوشیدہ تھا۔ وہ یہ کہ کسی صداقت کو خود اس کی اپنی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے۔ لہٰذا اول تو قرآن مجید کی حقانیت کو خود اس کے دلائل پر پرکھا جانا چاہیے تھا۔ بصورت دیگر اگر اس کے حق میں کوئی خارجی شہادت ہی مطلوب تھی تو یہ کافی تھا کہ وحی والہام کا علم رکھنے والے سنجیدہ اور صاحب کردار

اہل کتاب کی اس شہادت کو قبول کیا جاتا جو وہ اپنے عمل سے دے رہے تھے، اگر چہ ان کی تعداد کتنی ہی کم تھی۔ سورۂ شعرا میں اسی بات کی طرف قریش کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ فرمایا:

وَ اِنَّهُ لَفِی زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ. اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ. (الشعرآء ۲۶: ۱۹۶-۱۹۷)

''اور اس (قرآن) کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علماے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔''

سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا. اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا. وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا. وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۷-۱۰۹)

''ان سے کہہ دو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس کے پہلے سے علم ملا ہوا ہے جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔''

رہ گیا یہ سوال کہ یہ اچھے اہل کتاب کون لوگ تھے تو اس بارے میں تعین کے ساتھ صرف حبشہ کا اور مکہ میں مقیم تھوڑے سے نصاریٰ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے نصاریٰ کی جگہ جگہ تعریف کی ہے اور اس کثرت سے کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہی وہ گروہ ہے جو اسلام کی تعلیم سے جلد متاثر ہوا۔ چنانچہ مکہ میں رہنے والے نصاریٰ، جن کا تعلق دوسرے علاقوں سے تھا، ابتداء ہی میں مسلمان ہو گئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ یہود مکی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ جس قدر بحثیں اس دور میں انھوں نے اٹھائیں اور قرآن نے جس اہتمام سے ان کے موقف کو رد کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں ہو گا کہ ان کے انصاف پسند علماء کے ذہن مکی دور میں اسلام کے بارے میں صاف ہوئے ہوں گے اور وقت آنے پر وہ بھی اہل حق کے قافلہ سے آ ملے ہوں گے، اگر چہ ان کی تعداد بہت کم رہی ہو۔ مکی دور میں وہ اگر نمایاں نہیں ہوئے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہود کے مراکز مکہ سے باہر تھے جبکہ دین اسلام کا مرکز اس وقت مکہ شہر ہی تک محدود تھا۔

اہل کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ابتدائی سالوں میں اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ میں الجھنے سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گروہ دین وشریعت اورآسمانی صحف کا حامل اور پیغمبروں کی روایات کا امین تھا۔اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ جلد بابدیر دعوت کے بارے میں اس کے شبہات رفع ہوجائیں گےاوروہ حق کا علم بردار بن کر آگے بڑھے گا۔لہٰذا مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ بحث میں تلخی پیدا کرنے سے گریز کریں۔اس کے برعکس ان کو احساس دلائیں کہ ان کے اور اہل کتاب کے درمیان دینی تعلیمات اور اخلاقی اقدار مشترک ہیں۔مثلاً مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں کا معبود ایک اللہ ہے۔قرآن اور سابقہ صحیفوں میں توحید کی تعلیم یکساں ہے۔اہل کتاب جس طرح اپنے صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں مسلمان نہ صرف قرآن پر بلکہ ان کے صحیفوں کی حقانیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ تمام کتب سماوی کا منبع و ماخذ ایک ہی ہے۔پھر اہل کتاب کے صحیفوں کی پیشین گوئیاں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آ رہی ہیں۔لہٰذا مسلمان اہل کتاب کو بتائیں کہ ان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ ان مشترک تعلیمات واقدار کے لوازم کو تسلیم کریں اور اپنی مانی ہوئی باتوں کی اپنے عمل سے تردید نہ کریں۔سورۂ عنکبوت میں فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِيْ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. (العنکبوت ۲۹:۴۶)

’’اور اہل کتاب سے بحث نہ کرومگراس طریقہ پر جو بہتر ہے، بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں، اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمھاری طرف اتاری گئی، اور ہمارا اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔‘‘

چونکہ عرب معاشرہ میں اہل کتاب کو خاص احترام حاصل تھا قرآن نے اس کا لحاظ کیا۔حتیٰ کہ قریش کو دین کی اس دعوت میں جو اشکالات درپیش تھیں ان کے بارے میں انھیں مشورہ دیا کہ اہل کتاب چونکہ دینی امور سے واقفیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان اشکالات کے حل کے لیے ان کی طرف رجوع کریں۔مثلاً سورۂ نحل میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ

’’اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور

اِلَیۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ. (النحل ۱۶: ۴۳)

کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے تو اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔''

یہ ہدایت اس موقع پر دی گئی جب قریش کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایک بشر بھی خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اہل کتاب کی تاریخ اس بات کی شاہد تھی کہ منصب رسالت پر ہمیشہ بشر ہی فائز ہوتے رہے۔ یہی مضمون سورہ انبیاء آیت ۷ میں بھی ہے۔ سورۂ یونس میں فرمایا:

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـَٔلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ. وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ. (یونس ۱۰: ۹۴-۹۵)

''پس اگر تم شک میں ہو اس چیز کے بارے میں جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔ بے شک تم پر تمھارے رب کی طرف سے حق نازل ہوا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہوجیو جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ تم بھی نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔''

اس آیت میں وحی الٰہی کے بارے میں شکوک وشبہات رفع کرنے کے لیے قریش کو اہل کتاب کی طرف رجوع کا مشورہ دیا ہے۔ اس میں خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن عتاب کا رخ حقیقت میں مشرکین کی طرف ہے جن کا اٹھایا ہوا طوفان لوگوں کے دلوں میں قرآن کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔

اہل کتاب کے مخالفانہ رویہ پر گرفت

بعد میں جب اہل کتاب کا مجموعی رویہ قرآن کی مخالفت کی صورت میں سامنے آیا اور وہ اپنے تئیں حق پر قائم گروہ کی حیثیت سے سامنے لا کر کسی بھی نئی نبوت کو غیر ضروری قرار دینے لگے تو قرآن نے بھی ان کی اصلیت کو کھولنا شروع کر دیا اور واضح کیا کہ یہود ہوں یا نصاریٰ، یہ اس امانت کو ضائع کر چکے جو ان کے حوالہ کی گئی تھی اور جس کے سبب سے ان کی دینی حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔ اس عمل میں، مکی دور کے آخری سالوں میں، قرآن مجید نے ان دونوں گروہوں کے مرغوبات وعقائد پر سخت ضرب لگائی اور ان کی غلطیوں کو بے نقاب کیا۔ برے اہل کتاب کے قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال کے بارے میں مسلمانوں کو بتایا کہ تمام انبیاء اور ان

کے ساتھیوں کو اپنے اپنے زمانے کے شیاطین کے ہاتھوں ایسے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے۔ وہ پیغمبروں کے دعوتی منصوبوں کی راہ میں اپنے دجل وفریب سے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوتا ہے راہ حق کی آزمائش وابتلا کا حصہ ہوتا ہے جس سے گھبرانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ تمام مخالفت آہستہ آہستہ دم توڑ جائے گی۔ اہل ایمان یکسوئی کے ساتھ اپنے کام سے کام رکھیں۔

جوں جوں اہل کتاب کی طرف سے خلاف توقع مخالفت میں اضافہ ہوا تو ضروری ہو گیا کہ ان کی موجودہ دینی حیثیت کو واضح کیا جائے چنانچہ نصاریٰ اور یہود دونوں کے بارے میں نہایت اہم سورتیں مکی دور میں ہی نازل ہو گئیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مکہ میں یہود و نصاریٰ دونوں کا عمل دخل خاصا بڑھ گیا تھا۔ اور وہ نئی دعوت کے مقابلہ میں خاصا موثر کردار ادا کر رہے تھے جن کا توڑ کرنا اسی دور میں ضروری ہو گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ابتدائی سالوں میں تو اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ بعض اہل کتاب آنحضرتؐ کے پیغام کو ٹھیک طور پر سمجھ نہ پائے ہوں یا آپ کی نبوت ورسالت کے دلائل ان پر پوری طرح واضح نہ ہو سکے ہوں یا ان کے ذہنوں میں واقعی شکوک وشبہات پائے جاتے ہوں جن کے ازالہ کے بغیر وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ بات واضح تر ہوتی گئی کہ اہل کتاب اچھی طرح یہ جان چکے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت حقیقی نبوت ہے اور یہ وہی نبوت ہے جس کی بشارت انبیائے بنی اسرائیل دیتے رہے اور اپنی قوموں کو اس پر ایمان لانے اور اس کی نصرت کرنے کی تلقین کرتے رہے، جس کی نوید مسیح علیہ السلام نے سنائی اور جس کے انتظار میں اہل کتاب کی آنکھیں تھکتی رہیں۔ اس کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ انھوں نے ایسا رویہ اختیار کر لیا جو مکروفریب، سازش اور دین کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے سے عبارت تھا۔ لہٰذا مکی دور کے اواخر میں اہل کتاب کی ناسپاسی، منصب امامت کی ذمہ داریوں سے پہلوتہی، عہد خداوندی کی خلاف ورزی، اللہ کے دین کے خلاف مکروفریب، غرض ہر چیز کو نمایاں کیا گیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت کے معاملہ میں یہود اور نصاریٰ غیر جانب دار نہیں رہ گئے تھے اور نہ ان کا معاملہ اجنبیوں کا معاملہ تھا۔ وہ مخالفت بھی بھرپور انداز میں کر رہے تھے اور قرآن نے بھی ان کا جواب اسی انداز میں دیا۔

یہود پر تنقید

سورۂ اعراف کی آیات ۱۰۳ تا ۱۷۱ میں یہود پر اللہ تعالیٰ کے انعام واحسان کی تاریخ خاصی تفصیل سے بیان ہوئی

ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ اس قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے فرعون کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے۔فرعون حضرت موسیٰؑ کی دعوت سے سیخ پا ہو گیا جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کو طویل ابتلا سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی اور زیادتیوں کی سزا اس طرح دی کہ بنی اسرائیل کو تو سرزمین مصر سے بحفاظت نکال لیا اور فرعون کو دریا میں غرق کر دیا۔اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم شان دیکھنے کے بعد بنی اسرائیل پر واجب تھا کہ وہ اپنے رب کے شکر گزار رہتے لیکن انھوں نے فرعون کی غلامی سے آزادی پاتے ہی شرک اور بت پرستی کی طرف میلان ظاہر کیا اور خود موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے ایک محسوس معبود مقرر کریں۔موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس مطالبہ پر جھڑ کا تو انھوں نے ان کی عدم موجودگی میں، جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر تورات کے احکام لینے کوہ طور پر گئے ہوئے تھے، زیورات کو پگھلا کر بچھڑے کا مجسمہ تیار کیا اور اس کی پوجا میں لگ گئے۔حضرت موسیٰؑ واپس آئے تو قوم کے ذمہ دار بزرگوں پر خفا ہوئے کہ انھوں نے اس فتنہ کو کیوں پنپنے دیا۔بعد میں انھوں نے قوم کے ستر چیدہ بزرگوں کو ساتھ لیا اور اجتماعی توبہ کی غرض سے ان کو کوہ طور پر لے گئے۔اس موقع پر سب نے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح کر دیا کہ میری رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو میری نافرمانی سے بچتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے، میری آیات پر ایمان لائیں گے اور اس نبی امی رسول کی پیروی کریں گے جس کی علامات ان کو بتائی جائیں گی۔انھیں اس کی عزت کرنی ہوگی، اس کی مدد کرنی ہوگی اور اس روشنی کی پیروی کرنی ہوگی جو میں اس کے ساتھ اتاروں گا۔ایسے ہی لوگ فلاح پانے کے مستحق ہوں گے۔

یہ مفصل روداد سنانے کا مقصد اہل کتاب، بالخصوص یہود، کو ان کی ذمہ داری یاد دلانا تھا کہ وہ نبی امی رسولؐ پر، جو اب فی الواقع ان میں مبعوث ہو چکے ہیں ایمان لائیں اور ان کی حمایت ونصرت پر کمر بستہ ہو کر اپنے آپ کو فلاح کا مستحق بنالیں۔

اسی بیان میں آگے بنی اسرائیل کی بعض نالائقیوں کا ذکر کیا اور بتایا ہے کہ ایسے جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو دنیا میں تتر بتر کر دیا اور وقتاً فوقتاً ان پر سخت گیر لوگ مسلط کیے جو ان کو طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالتے رہے۔اگر یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق سیکھیں تو اب ان کے لیے اصلاح احوال کا آخری موقع ہے ورنہ ان کا معاملہ دنیا کی ذلت کے علاوہ آخرت میں تباہی پر منتج ہوگا۔

یہود کو ہمیشہ اس بات پر فخر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ عہد و پیمان کیا۔حضرت موسیٰؑ احکام کے نزول کے

زمانہ میں ہر حکم پر قوم کو اکٹھا کرتے اور حکم سنا کر ان سے عہد لیتے کہ وہ اس پر کاربند رہیں گے اور کسی صورت میں اس سے انحراف نہیں کریں گے۔ بنی اسرائیل جماعت کی حیثیت سے اللہ کو ضامن اور گواہ بنا کر سمع و طاعت کا عہد کرتے۔ مکی دور نبوت کے اواخر میں یہود کو توجہ دلائی گئی کہ خداوند سے عہد باندھنے کی ایک طویل تاریخ کے بعد اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس عہد کو پورا کریں اور مصلحتوں کے تحت اس عہد کے بخیے نہ ادھیڑیں ورنہ ان کی مثال اس بڑھیا کی ہو گی جو مدتوں بڑی محنت سے اپنا سوت نہایت مضبوط کاتے لیکن جب اس کے استعمال کا وقت آئے تو وہ اس کا تار تار ادھیڑ کر رکھ دے۔

یہود اپنے مشوروں کو دلفریب بنا کر قریش کے سامنے پیش کرتے اور ان کا اعتبار قائم رکھنے کے لیے قسمیں کھا کھا کر ان کو یقین دلاتے کہ ان کی رائے محض خیر خواہی کے جذبہ پر مبنی ہے۔ اصل میں یہ مکر و فریب کی ایک اسکیم ہوتی جس کا مقصد قریش کو اپنے موقف پر قائم رکھنا، آنحضرت ؐ کی مخالفت پر مضبوط رکھنا، مسلمانوں کے حوصلے پست کرنا اور اللہ کے دین کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنا ہوتا۔ قرآن مجید نے یہود کی اس سازش کا پردہ چاک کیا اور ان کی تگ و دو کے مضمرات آشکارا کر دیے۔ اس نے بتایا کہ یہود کی تمام سرگرمی اس حاسدانہ اندیشہ کی بنا پر ہے کہ نئی قائم ہونے والی امت کہیں یہود سے تعداد اور قوت میں بڑھ نہ جائے۔ لہٰذا یہ مسلمانوں کے قدموں کو ڈگمگانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور نئی دعوت پر کان دھرنے والوں کے اندر وسوسے ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

یہود کا طرز عمل کسی طرح اخلاص پر مبنی نہ تھا۔ وہ اپنے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ قرآن نے ان کے اس کردار کو کتوں کی حرص و دناءت سے تشبیہ دی۔ کتا اپنی مرغوبات کی بو سونگھتا ہوا چلتا اور جس طرف سے اپنی پسند کی بو پاتا ہے اسی طرف مڑ جاتا ہے۔ اسی طرح یہود نے بھی ہدایت کے معاملہ میں اپنی خواہشات نفس اور مفادات دنیا کو رہنما بنا لیا اور اس حرکت میں وہ اپنے عہد و میثاق اور منصبی ذمہ داریوں ہر چیز کو بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر انعامات بھی کیے اور تنبیہات بھی اتاریں لیکن یہ چیزیں ان کے لیے مفید ثابت نہ ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو زمین و آسمان کی سرفرازی سے نوازنا چاہا لیکن دنیا کی حرص اس میں رکاوٹ بن گئی اور یہ قوم اپنے آپ کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ یہود کی اس خصلت کا ہر ہر پہلو مکی دور ہی میں قرآن نے بے نقاب کر دیا۔ اس کی بے رحم تنقید اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ یہود کا کردار اس دور میں معمولی نہیں رہ گیا تھا اور وہ آنحضرت ؐ کی جدوجہد میں مسلسل روڑے اٹکا رہے تھے جس کا تدارک ضروری

ہو گیا تھا۔

نصاریٰ پر تنقید

یہود کی طرح نصاریٰ کے معتقدات بھی مکی دور ہی میں زیر بحث آ گئے البتہ ان کے تذکرہ میں اس طرح کی تلخی نہیں معلوم ہوتی جو یہود کے لیے پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہود مکروفریب اور سازش سے کام لیتے جب کہ نصاریٰ گمراہی اور غلط فہمی کا شکار تھے۔ نصاریٰ کے غلط معتقدات میں اس زمانہ میں بھی الوہیت مسیح یا مسیحؑ کے مجسم خدا ہونے کا عقیدہ، ان کے خدا کا بیٹا ہونے کا تصور اور آخرت میں نجات دہندہ ہونے کا عقیدہ شامل تھے۔ ان کے ابطال کے لیے ایک کامل سورہ مریم نازل ہوئی۔ اس سورہ کا آغاز حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں خارق عادت طور پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے تذکرہ سے ہوا ہے۔ وہ خود بڑے بوڑھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ ان کی عاجزانہ دعا کی قبولیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹے سے نوازا۔ اسی بیت المقدس میں، جہاں حضرت زکریاؑ متولی و سربراہ کار تھے، حضرت مریم علیہا السلام ایک عابدہ وزاہدہ خدمت گار خاتون تھیں۔ اس پرہیزگار عفیفہ خاتون کے ہاں بھی خارق عادت طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے اپنے حکم خاص سے ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جو بن باپ پیدا ہوا اور ماں کی گود ہی میں اپنے متعلق گواہی دی کہ وہ اللہ کا بندہ اور بنی اسرائیل کی طرف اس کا رسول ہے۔ یہ بچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جن کو عیسائیوں نے ابن اللہ کا درجہ دے دیا اور ان کی الوہیت کے قائل ہو گئے۔ مذکورہ دونوں ولادتوں کو پہلو بہ پہلو لا کر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر خارق عادت ولادت کسی کے الٰہ ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے تو یہ شرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی حاصل تھا لیکن اس بنا پر نہ انھوں نے اپنی الوہیت کا دعویٰ کیا نہ کسی دوسرے نے ان کو الٰہ مانا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے پیروکار عقل کا دامن کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت مریمؑ ہیکل کی خدمت پر مامور خدا کی بندی تھیں۔ ان کے ہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو مسیح علیہ السلام کا بشر ہونا از خود ثابت ہو گیا۔ اس کے باوجود سیدنا مسیحؑ نے گہوارے سے لے کر اپنی دعوت کے آخری مراحل تک اس حقیقت کا برملا اعلان کیا کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، اسی نے ان کو کتاب و نبوت سے سرفراز فرمایا اور دین و شریعت کی اساسات، نماز اور زکوٰۃ، پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ انھیں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ولادت، موت اور دوبارہ جی اٹھنے کے مراحل سے گزرنا ہے لہٰذا ان کی حیثیت کسی طرح دوسرے انسانوں سے مختلف نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ وہ میرا

بھی رب ہے اور تمھارا بھی۔ گویا جو نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی اپنی تھی وہی نسبت انھوں نے اپنے مخاطبوں کے لیے بھی بیان کی۔ اگر اس نسبت کا مفہوم ابن اللہ ہونا ہے تو پھر تمام لوگ ابن اللہ ٹھہرے اور مسیح علیہ السلام کی یہ الگ خصوصیت نہ رہی۔

سورہ مریم میں انبیاء علیہم السلام کی روایت پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا گیا ہے کہ صالحین و اخیار کا یہ گروہ ہر دور میں شرک سے بیزار، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے والا اور اس کے لیے عبودیت کا اظہار کرنے والا رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی روایت کے امین تھے اور یہی روایت ان کے پیروکاروں کو عزیز ہونی چاہیے۔ ان انبیائے کرام کی ایک بڑی صفت وحی الٰہی کے لیے ان کی رغبت تھی۔ وہ اس کی ایک ایک آیت سے متاثر ہوتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ ان کے حقیقی متبعین اہل کتاب کو انھی کی طرح اس وحی کی طرف صدق دل سے راغب ہونا چاہیے جو اب نازل ہو رہی ہے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ شیاطین کے پیچھے لگ کر اس سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

سورہ مریم کا ایک اہم مضمون یہ ہے کہ مرنے کے بعد تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ ان کے لیے کوئی دوسری منزل نہیں ہے۔ ہر شخص فرداً فرداً محاسبہ کے لیے پیش ہوگا۔ نہ اس کے اعوان و انصار ساتھ ہوں گے اور نہ کوئی حمایتی اور مددگار۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت بروئے کار آئے گی جس کا تقاضا اس دن یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان انصاف کرے، حق پرستوں کی دادرسی کرے، اور ظالموں کو جہنم رسید کرے۔ اس دن جنت میں داخلہ کے مستحق وہ لوگ قرار پائیں گے جو متقی ہوں گے اور ان کا عمل ان کی پرہیزگاری کی شہادت دیتا ہوگا۔ اس دن پذیرائی متقین کی ہوگی اور وہ خدائے رحمان کے حضور عزت و اکرام کے ساتھ پیش ہوں گے جب کہ مجرم پیاسے اونٹوں کی طرح جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکے جائیں گے۔ ان کے مزعومہ شفعاء کو شفاعت کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ اس بیان میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھرپور تردید ہے کہ آخرت میں مسیح علیہ السلام نجات دہندہ ہوں گے اور ان پر ایمان کو اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام گناہوں کا کفارہ قرار دے دے گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن نے قریش کی روش پر تبصرہ کر کے نہ صرف ان کو نیک و بد سمجھا دیا بلکہ ان کی حمایت میں بولنے والے اہل کتاب کی اپنی نالائقیوں سے بھی پردہ اٹھا دیا تاکہ قریش پر واضح ہو جائے کہ جن پر وہ تکیہ کیے ہوئے ہیں خود وہ خدا کی میزان میں کیا وزن رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ اہل کتاب ان کو کوئی مشورہ دیں گے تو اس کی کیا وقعت ہوگی۔

گل رحمان ہمدرد

برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے ماخذ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

مغربی ممالک جب عالمِ اسلام پر حملہ آور ہوئے تو برصغیر پاک و ہند اور افغانستان کے سوا کسی دوسرے اسلامی ملک میں اُنھیں فکری عملی میدان میں کسی خاص ردِعمل کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ ہندوستان پر قبضہ کرتے ہوئے اُنھیں عملی میدان میں سلطان ٹیپو، تحریک شہیدین اور 1857ء کی جنگِ آزادی کی صورت میں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

فکری و علمی سطح پر بھی مغربی فکر کی حمایت و مخالفت میں عالمِ اسلام کے دوسرے ملکوں میں کوئی خاص ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ یہ معرکہ بھی صنم خانۂ ہند میں ہوا اور جس کے نتیجے کے طور پر ہماری یہ قوم دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ نہ مغربی تہذیب اس قابل ہے کہ اُسے سمجھا جائے، نہ مغربی علوم اس قابل ہیں کہ اُنہیں حاصل کیا جائے اور نہ مغربی ٹیکنالوجی اس قابل ہے کہ اُسے استعمال کیا جائے۔ ہندوستان کے تمام مذہبی فرقوں کی یہی سوچ تھی اور اِس کا سب سے بڑا مرکز دیوبند تھا۔ اس گروہ کے اکابرین نے اگرچہ تعلیم و تعلّم، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تصحیح عقائد و اعمال، تزکیہ قلوب و اصلاح نفوس، دعوت و تبلیغ، جہاد و قتال اور حفاظتِ دین و شریعت کے ضمن میں انتہائی اہم اور قابلِ قدر خدمات انجام دیں، مگر تاریخِ اسلام کے اس نازک مرحلے پر مغربی تہذیب، اُس کے علوم اور اُس کی ٹیکنالوجی کی نسبت انھوں نے جو خانقاہی روش اپنائی وہ ہر اعتبار سے غلط تھی، جس کے نتیجہ کے طور پر ایک طرف تو ہماری قوم کو بہت بڑا نقصان اُٹھانا پڑا جس کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی اور دوسری طرف برصغیر کا مذہبی

طبقہ زمانے کی رفتار سے بہت پیچھے رہ گیا، جس کی وجہ سے برصغیر میں اسلام کے مقاصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا مرکز اُتر پردیش کا علاقہ علی گڑھ تھا۔ یہ گروہ ایک دوسری انتہا پر تھا۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب اور اس کے علوم ہی سب کچھ ہیں۔ اگرچہ تعلیمی و تحریکی اور کسی حد تک فکری میدان میں اس گروہ کے اکابرین نے بھی انتہائی اہم کارنامے انجام دیے۔ بالخصوص سر سید احمد خان، جسٹس امیر علی، عنایت اللہ خان المشرقی اور غلام احمد پرویز کی خدمات ہماری ماضی قریب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ تاہم ایک مستقل نظامِ فکر کی حیثیت سے ان کے نظریات کو اپنانا اور ان پر عمل کرنا اُمتِ مسلمہ کے لیے سخت نقصان دہ تھا اور ایسا کرتے ہوئے ہم اپنے عظیم علمی و روحانی اور تہذیبی و ثقافتی ورثہ سے محروم ہو جاتے۔

یہ دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ انتہاؤں پر تھے اور ضرورت اس امر کی تھی کہ سرتاپا جامد مذہبی قدامت پسندی اور سرتاپا متحرک سائنسی و لادین جدّت پسندی کے درمیان امتزاج و مصالحت کی سبیل نکالی جائے۔ تاکہ ایک طرف ہم اپنے علمی و روحانی اور تہذیبی و ثقافتی تشخص کو برقرار رکھ سکیں اور دوسری طرف جدید تہذیب، اس کے علوم اور اس کے ثمرات سے بھی مستفید ہو سکیں۔ قوموں کی زندگی کے اس مرحلہ پر عموماً عظیم شخصیات کا ظہور ہوتا ہے اور عالمِ اسلام میں بھی ایک بہت ہی عظیم شخصیت سامنے آئی۔ وہ مغربی و مشرقی علوم پر یکساں عبور رکھنے والے انسان تھے اور عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی و فرانسیسی بھی بڑی روانی کے ساتھ بول سکتے تھے۔ مشرقی علوم کی تحصیل اُنھوں نے افغانستان، ہندوستان، ایران، ترکی، حجاز اور مصر جیسے ممالک میں کی تھی تو مغربی علوم کی پیاس روس، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، فرانس اور امریکہ کے علمی سرچشموں سے بجھائی تھی۔ وہ دُنیاے اسلام کے پہلے شخص تھے جنھوں نے مغربی اقوام کی سیاسی غلامی کے خلاف باقاعدہ ایک تحریک کا آغاز کیا۔ بعد میں عالم اسلام میں آزادی کی جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں، اُن سب کا سلسلہ اُنھی کی تحریک استخلاص دیار المسلمین سے جا کر ملتا ہے۔ وہ جدید دُنیاے اسلام کے پہلے شخص تھے جنھوں نے اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ فکر پیش کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اُنھوں نے دنیا کے استحصالی نظاموں بالخصوص سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی زبردست مخالفت کی اور خدا کی زمین پر خدا کا نظام نافذ کرنے کے لیے ''جمعیت العروۃ الوثقٰی'' کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ بعدازاں دنیاے اسلام میں جتنی بھی اصلاحی و احیائی تحریکیں اُٹھیں اُن سب کا تعلق بھی اسی جماعت سے جا کر ملتا ہے۔ اُنھوں نے اسلامی قومیت کے نظریہ کو پہلی مرتبہ مدلّل انداز میں پیش کیا۔ فتنہ تصوف کی سرکوبی کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور وحدت الوجود کے گمراہ کن تصور کا رد بھی کیا۔ مذہبی و خانقاہی قدامت پسندوں پر بھی زوردار تنقید کی اور سائنسی و لادین جدت پسندوں کی بھی مخالفت کی۔

اُنھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ کیا اور اُن کی روحانی و اخلاقی تربیت پر بھی زور دیا۔ادب و صحافت کی اصلاح بھی کرنی چاہی اور اسلامی علوم کی تشکیل جدید کی دعوت بھی دی۔ عالم اسلام کی اس عظیم شخصیت کا نام ہے شیخ المشرق سید جمال الدین افغانی۔اقبال نے جن کے بارے میں کہا تھا:

سید السّادات مولانا جمال　　　　زندہ از گفتارِ او سنگ و سفال

جاوید نامہ

وہ 1838ء میں افغانستان کے قصبہ اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ 1850ء میں اپنے علاقے کے ایک مدرسہ میں داخل ہوئے۔ 1856ء میں وہاں سے فارغ ہوئے اور اسی سال وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ یہاں کلکتہ میں قیام کیا۔کلکتہ کالج کے پروفیسروں سے انگریزی زبان سیکھی اور 1857ء میں واپس افغانستان چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے ''شمس النہار'' کے نام سے ایک اصلاحی جریدہ جاری کیا۔ اور افغانستان کے نیک دل راہنما شیر علی کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی جہد و جہد کرتے رہے۔اُن کی یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ شیر علی پوری شان و شوکت کے ساتھ تخت کابل پر براجمان ہوئے اور جمال الدین افغانی اس حکومت کے وزیر اعظم بن گئے۔ 1869ء میں اُن کے مخالفین کو غلبہ حاصل ہو گیا اور اُن کے لیے افغانستان میں رہنا ناممکن ہو گیا تو وہ ہندوستان چلے آئے۔لیکن یہاں دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ حکومتِ وقت نے ہندوستان سے نکلنے کا حکم دے دیا تو آپ مصر چلے گئے۔ مصر میں جامعہ الازہر میں قیام فرمایا۔ 1870ء میں ترکی چلے گئے۔ ترکی میں آپ نے مختلف خطبات دیئے۔ترکی میں فتنۂ تصوف کی ردّ میں اُنھوں نے زوردار مہم چلائی۔ اُنھوں نے محکم دلائل سے ثابت کیا کہ اسلام میں تصوف یا طریقت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔اس پر ترکی کے صوفیاء بالخصوص شیخ الاسلام صوفی حسن فہمی اور صوفی یونس وہبی نے آپ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔صوفیوں کی سخت ترین مخالفت کی وجہ سے آپ کو ترکی سے نکلنا پڑا۔ 1871ء میں آپ نے پھر مصر کا رُخ کیا اور ایک مرتبہ پھر جامعہ الازہر میں مقیم ہو گئے۔ اس مرتبہ وہ اس درس گاہ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ 1879ء میں مصر کی فرنگی حکومت نے آپ کو مصر سے نکال دیا اور آپ ہندوستان چلے آئے۔ ہندوستان میں اُنھوں نے مادیت پرستی اور دہریت کے خلاف ''الدّھریہ'' اور نیچیریت کے خلاف ''ردّ نیچیریت'' کے نام سے کتابیں لکھیں اور نتیجتاً ہندوستان سے بھی رختِ سفر باندھنا پڑا اور آپ روس چلے گئے۔ آپ نے ایک سال سے زیادہ عرصہ وہاں قیام کیا۔ روس میں اشتراکیت کے خلاف آپ نے جو کچھ فرمایا اُس کا خلاصہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب جاوید نامہ میں ''جمال الدین افغانی کا پیغام حکومتِ روسیہ کے نام'' کے تحت نقل کیا ہے۔ وہاں سے پھر افغانستان آئے۔ افغانستان میں انھوں نے

''کابل'' کے نام سے ایک مجلّہ جاری کیا۔ اور اپنی مشہور کتاب ''تتمۃ البیان'' کی تشہیر و اشاعت کا اہتمام کیا۔ کچھ عرصہ افغانستان میں اپنی فکر کا تخم بونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان تشریف لے آئے اور یہاں تقریباً دو سال مقیم رہے۔ ہندوستان میں وہ کوچہ بہ کوچہ گھوم پھر کر ذہین افراد تک اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ نیز رسالہ ''معلم'' حیدر آباد، ''دارالسلطنت'' کلکتہ' 'مشیرِ قیصر'' لکھنؤ، ''حبل المتین'' کلکتہ اور اودھ اخبار میں مضامین و مقالات لکھ کر شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ فارسی زبان میں اُن کے مقالات کا پہلا مجموعہ بھی اسی دوران کلکتہ سے شائع ہوا۔ برسوں کی تگ و دو کے بعد بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عالمِ اسلام کی مردہ زمین میں تخم ریزی کے بجاے اُنھیں مغربی ممالک میں قیام کرنا چاہیے اور وہاں عالمِ اسلام کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے ذہین طلباء تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی سلسلہ میں وہ امریکہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں ''دعوت'' کا کام کرنے کے بعد لندن چلے گئے۔ وہاں سے جرمنی چلے گئے اور بالآخر فرانس چلے گئے جہاں غالباً وہ پانچ سالوں تک مقیم رہے۔ فرانس میں قیام کے دوران اُنھوں نے ''العروۃ الوثقٰی'' کے نام سے ایک عربی رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے کے بنیادی طور پر پانچ مقاصد تھے۔

۱۔ عالمِ اسلام کی سیاسی آزادی

۲۔ اسلامی نظام کے قیام کی دعوت

۳۔ اسلامی علوم کی تشکیلِ جدید کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا

۴۔ اسلام کی دعوت کو جدید اسلوب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنا

۵۔ مسلمانوں کو جدید علوم کی تحصیل کی طرف راغب کرنا

انھی مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے اسی ''العروۃ الوثقٰی'' کے نام سے ایک جماعت بھی بنائی تھی۔ سید قاسم محمود نے اس جماعت کا ذکر اپنی اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں لفظ ''جمعیت'' کی ذیل میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ان جمعیتوں میں ایک اور مشہور اور ذی اثر جماعت 'جمعیت العروۃ الوثقٰی' تھی جو مسلمانوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی اور جس کے ارکان نے ایک حقیقی اسلامی حکومت قائم کرنے کا حلف اُٹھا رکھا تھا۔ اس جماعت کے روح رواں مشہور و معروف شخصیت جمال الدین افغانی اور اُن کے شاگرد مفتی محمد عبدہ تھے۔ یہ اُس زمانے میں قائم ہوئی جب مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس جمعیت کی شاخیں مختلف ممالک میں قائم تھیں''۔

فرانس میں قیام کے دوران آپ نے مشہور فرانسیسی مستشرق ''ریناں'' کی کتاب Islam and Science

کے رد میں، جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام کی روح سائنس کے خلاف ہے اسی نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ثابت کیا کہ اسلام کی رُوح سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ بعدازاں آپ 1889ء میں ایران تشریف لے گئے۔ ایران میں آپ نے اپنا ایک حلقہ بنالیا۔(واضح رہے کہ بعد میں ایران کی انقلابی قیادت کا سلسلہ اسی حلقہ سے جا کر ملتا ہے)۔ ایران کے اُس وقت کے بادشاہ نے آپ کے مداحوں کی کثرت دیکھ کر اس گمان پر آپ کو ایران سے نکال دیا کہ:

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ایران میں آپ کے ساتھ ہونے والے توہین آمیز سلوک پر زبردست ہنگامے پھوٹ پڑے۔ انھی ہنگاموں میں ایران کے اُس وقت کے بادشاہ ناصر الدین قتل ہوئے تھے۔ ایران سے اخراج کے بعد آپ عراق چلے گئے کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد 1891ء کے اوائل میں لندن چلے گئے۔ اس مرتبہ اُنھوں نے ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ وہاں قیام کیا۔ لندن سے اُنھوں نے ''ضیاء الخافقین'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ جس کے بعض اقتباسات بعد میں المنار میں بھی شائع ہوئے۔

1892ء میں اُنھیں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ سلطان نے لکھا تھا کہ آپ یہاں آ کر اپنے نظریات کی تبلیغ کریں۔ ہم آپ کے لیے قیام وطعام کا انتظام بھی کریں گے اور آپ کے لیے وظیفہ بھی مقرر کریں گے۔ جمال الدین افغانی نے یہ دعوت قبول کر لی اور 1892ء کے وسط میں ترکی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ترکی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ خلیفہ عبدالحمید ثانی اپنی خلافت کے لیے افغانی سے حقیقی اسلامی خلافت کی سند حاصل کر کے پورے عالمِ اسلام کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ انگریزوں کے ممکنہ حملہ کا سدّ باب کیا جا سکے۔ جمال الدین افغانی جو کہ حقیقی جمہوریت کو اسلام کا سیاسی نظام قرار دیتے تھے، ظاہر ہے کہ ایک جابر غیر اسلامی حکومت کو سندِ جواز کیسے فراہم کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے اس سے انکار کر دیا۔

سلطان نے غصہ میں آ کر وظیفہ بھی بند کر دیا اور اُنھیں جیل میں ڈال دیا۔ 1892ء سے 1897ء تک تقریباً پانچ سال وہ قید میں رہے۔ نظر بندی کے دوران بھی اُن کی انقلابی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ جن کی وجہ سے سلطان کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ اُن کا حشر بھی ویسا نہ ہو جائے جو اس سے قبل ایران کے شاہ ناصر الدین کا ہو چکا تھا۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے کارندوں کے ذریعہ سے اُنھیں زہر دلوا دیا جس کی وجہ سے وہ 9 مارچ 1897ء کو اپنے خالقِ

حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

وہ کم وبیش پانچ عشروں تک وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا فریضہ انجام دیتے رہے اور اپنے مشن میں اتنے منہمک رہے کہ پوری زندگی انھیں شادی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ آپ کو استنبول میں دفن کیا گیا۔ آپ کے ایک امریکی دوست مسٹر کراین نے اُن کی قبر پر سنگِ مرمر کا ایک شاندار مزار تعمیر کروایا۔ بعدازاں 1944ء میں آپ کے جسدِ خاکی کو کابل منتقل کر دیا گیا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شُد بعشق

ثبت است برجریدہ عالم دوامِ ما

مشہور صحافی اور ادیب قاضی عبدالغفار نے 21 فروری 1932ء کو اُردو اکادمی ہند میں جمال الدین افغانی پر ایک مفصل لیکچر دیا۔ اس میں وہ کہتے ہیں:

''...... (قائدین و مفکرین اسلام) کی اس تمام فہرست میں شیخ ہی کا نام ایسا ہے جو عمل کی جغرافیائی حدود سے آزاد رہا اور کبھی کسی ایک ملک کا پابند نہ تھا۔ وہ دیارِ مصر میں تھا، وہ ایران میں تھا، وہ ہندوستان میں تھا، حجاز میں تھا، ترکی میں تھا، روس میں تھا، فرانس میں تھا، اُس کی ایک آواز تھی جو مراکش سے ترکستان تک اور لندن و پیرس سے سینٹ پیٹر برگ (ماسکو) تک سنی گئی۔ عہد جدید کے داعیان ملت اسلامی میں بمشکل کوئی نام اس قدر ہمہ گیر، اس قدر عام اور وسیع مل سکے گا۔ یہ امتیاز شیخ ہی کے لیے محفوظ تھا''۔ (جمال الدین افغانی، مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی)

مشہور مفکر بلنٹ اپنی کتاب Secret History of The Occupation میں اُن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جمال الدین کی ذہانت وجدت یہ تھی کہ اُنھوں نے اسلامی ممالک کے مذہبی خیالات رکھنے والے لوگوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اِس امر کی تبلیغ و تلقین کی کہ اسلام کے حالات پر نظر ثانی کی جائے اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے، جدید علوم کے ساتھ پرانی ذہنیت کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن وحدیث سے اُن کی واقفیت نے ثابت کیا کہ اگر صحیح معنی سمجھے جائیں اور شریعت و اصلاحات سیاسی کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسلام کے اندر نہایت وسیع تغیرات کی گنجایش موجود ہے اور مشکل سے کوئی اصلاح ایسی ہوگی جو شریعت کے خلاف ہو......

مصر میں شیخ نے اچھی طرح ثابت کر دیا تھا کہ اسلام انسانوں کی تمام (روحانی و مادی) ضروریات کا کفیل ہونے

کے قابل ہے اور عہد جدید کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے......

علماء کے ضمیر و تخیل کو وہ ان زنجیروں سے آزاد کرنا چاہتے تھے جس میں کئی صدیوں سے وہ جکڑے ہوئے تھے......''

امریکی مورخ لوتھروپ سٹوڈرڈ اپنی کتاب The New World of Islam میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سید جمال الدین افغانی زبردست حکماے اسلام میں سے تھے......آپ نے آنے والی قوموں کے لیے بصیرت افروز اور عبرت انگیز درس موعظت چھوڑے ہیں''۔

ہانس کوہن اپنی کتاب The History of Nationalism in The East میں لکھتے ہیں:

''جمال الدین پہلے شخص ہیں جنھوں نے حالیہ زمانے میں اتحاد اسلامی کے خیال کو تازہ کیا......وہ جہاں کہیں بھی گئے، اپنے خیالات کے نقوش چھوڑے۔ اُنھوں نے حالاتِ حاضرہ کا اندازہ لگا کر نصرانی یورپ کے خطرے کے خلاف اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا......''

براؤن اپنی کتاب The Revolution of Persia میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب کی شخصیت نادر الوجود تھی۔ قد و قامت اور وجاہت شاہانہ پُر رعب اور پُر کشش تبحر علم اور وسعتِ معلومات کا دریاے بے کنار، تحریر میں اس قدر غیر معمولی اثر کہ سامعین و قارئین سب کفن بسر اور شمشیر بکف جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اُن کے عزم و ارادہ کے سامنے دنیا کی متحدہ قوت کو عاجز و سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔ عرب و عجم کے مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلاف کو طاقِ نسیاں کے سُپرد کر دیا تھا اور اُن کی ہر تجویز پر عمل کرنے کے لئے کمر بستہ ہو گئے تھے۔ شرق و غرب کے مخالفین اُن کے نام سے لرز جاتے تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ سراپا احرام خاصانِ خدا میں سے تھا''۔

فرانسیسی مفکر موسو ہنری نے جمال الدین سے ایک ملاقات کے بعد کہا: ''سید جمال الدین میں ایک پیغمبر کی سی خوبیاں پائی جاتی ہیں''۔

انڈلف چرچل کہتے ہیں: جمال الدین افغانی بہت صاف گو اور نہایت اعلیٰ فکر رکھنے والے انسان تھے''۔

رینا، جنھیں افغانی نے علمی معرکہ میں شکست سے دوچار کیا تھا۔ اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں: ''سید جمال الدین افغانی ایک حیرت انگیز ہستی تھے، جو ایک طوفان کی طرح دنیا پر چھا گئے''۔

عیسائی مفکر جرجی زیدان اپنی کتاب ''مشاہیر الشرق'' میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب کی زندگی اور کارناموں کے مختصر حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقصد جو ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہا، اتحاد اسلام تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے واحد خلیفہ اسلام کے ماتحت لایا جائے۔ اس کوشش میں اُنھوں نے دنیا کی سب خوشیوں کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ شادی بھی نہیں کی تھی..........مشرق نے ان کی قربانیوں سے فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ اٹھاتا رہے گا''۔

ممتاز محقق سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

''یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عالمِ اسلام کی تمام جدید (سیاسی، علمی و اصلاحی، احیائی وتجدیدی) تحریکوں کا مبدا ومنبع افغانی کی تعلیمات ہیں''۔

اپنے ایک مضمون میں وہ دنیاے اسلام کے جدید مفکرین وقائدین کی ایک طویل فہرست دینے کے بعد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

''احیاے اسلام کی تاریخ کے آسمان پر یہ سب ستارے اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں میں جگمگاتے ہوئے صاف صاف نظر آتے ہیں۔ لیکن یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب جمال الدین افغانی کے آفتاب تازہ سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ کسی بھی ملک کی احیائی اسلامی تحریک کے تذکرے سے پہلے چاہیے کہ سیّد افغانی اور اُن کی تحریک اتحادِ اسلامی کا ذکر ہو، تمام حالیہ اسلامی تحریکوں کی ماں سیّد افغانی کی پان اسلامزم کی تحریک ہے''۔

علامہ اقبال نے آپ کو گزشتہ صدی کا مجدد اعظم قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی وعجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے بعض علماء یا قائدینِ اُمت کو مجدد یا مہدی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔.......... زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کے مستحق ہیں تو وہ صرف اور صرف جمال الدین افغانی ہیں۔ مصر، ایران، ترکی اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اُسے سب سے پہلے عبدالوھاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخرالذکر ہی اصل میں مجدد ہیں زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا۔ اگر قوم نے اُن کو عام طور پر مجدّد نہیں کہا یا اُنھوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا، تو اس سے اُن کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہلِ بصیرت کے نزدیک نہیں آتا''۔

(ذکر اقبال، صفحہ ۲۶۵)

نیز جاوید نامہ کے روحانی سفر میں افلاک میں کسی مقام پر نمازِ فجر کا وقت ہوتا ہے تو وہ نماز بھی اسی امام مشرق کی امامت میں ادا کی جاتی ہے۔ یہ گویا ایک تمثیل ہے۔ نمازِ فجر سے مراد اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی صبح ہے اور جمال الدین

افغانی کا بحیثیت امام منتخب کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے بانی اور اپنے زمانے کے مجدد اعظم جمال الدین افغانی ہیں۔

ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی متعدد تصانیف میں اُن کی سیاسی و دینی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ وہ بھی اُن کو اپنے زمانے کا مجددِ اعظم سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کی تاریخ مشرق نے اصلاح وتجدّد کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اُن میں کوئی شخصیت وقت کی عام پیداوار سے اس قدر مختلف اور اپنی طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوتوں میں غیر معمولی نہیں ہے، جس قدر سید جمال الدین کی شخصیت ہے۔ بغیر کسی تامل کے کہا جاسکتا ہے کہ مشرقِ جدید کے رجالِ تاریخ اور قائدینِ فکر کی صف میں اُس کی شخصیت کئی اعتبار سے اپنا سہیم وشریک نہیں رکھتی۔

مذہب اور علم دونوں میں اس کی مصلحانہ ذہنیت نمایاں ہوتی ہے اور کسی گوشہ میں بھی اس کے قدم وقت کی مقلدانہ سطح سے مس نہیں ہوتے۔ سیاست میں وہ سرتاپا انقلاب کی دعوت دیتا ہے اور جہاں کہیں جاتا ہے چند دنوں کے اندر مستعد اور صالح طبیعتیں چُن کر انقلاب وتجدّد کی روح پھونک دیتا ہے''۔

(حرف آغاز، مقالات افغانی، اُردو ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی)

ابوالکلام آزاد نے جب الہلال جاری کیا تو اُس کے پہلے شمارے کے سرِ ورق پر سید جمال الدین افغانی کی تصویر تھی۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصر میں جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد رشید رضا مصری نے المنار اور الہلال کے نام سے دو رسالے نکالے تھے۔ الہلال کا نام بھی ابوالکلام 1908ء میں مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پھر الہلال کے ہر دوسرے تیسرے شمارے میں جمال الدین افغانی کی تصویر ہوتی تھی اور ساتھ ہی ابولکلام کے تاثرات درج ہوتے تھے۔

ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی جمال الدین افغانی کی ذات سے بڑی عقیدت تھی۔ 1944ء میں جمال الدین افغانی کے جسد خاکی کو استنبول سے کابل منتقل کیا جارہا تھا تو پروگرام کے مطابق اُس کو دہلی سے لاہور لایا گیا اور یہاں بادشاہی مسجد میں دیدار عام کے لیے رکھا گیا (اس واقعہ پر غلام رسول مہر نے ایک ادبی نوعیت کا مضمون بھی لکھا ہے) تو ابوالاعلیٰ مودودی پٹھان کوٹ سے اُن کے دیدار کے لئے تشریف لائے تھے۔ ذیلدار پارک کی روحانی فضا میں ممتاز فلسفی اسکالر ڈاکٹر وحید عشرت سے گفتگو کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ ہمارے زمانے میں عالم اسلام میں جو سب سے بڑی شخصیت پیدا ہوئی وہ جمال الدین افغانی کی تھی، لیکن تعجب ہے کہ اس قوم نے سب سے زیادہ اُنھی کو

بھلایا ہے۔ اس پر ڈاکٹر وحید عشرت نے سوال کیا کہ یہ شخصیت اگر اتنی ہی اہم تھی تو آپ نے اپنی کتاب ''تجدید و احیاے دین'' میں اُن کی تجدیدی خدمات کا ذکر کرنا مناسب کیوں نہیں سمجھا؟ مولانا اپنے روایتی انداز میں مسکرائے اور فرمایا: ''تجدید و احیاے دین'' میری کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ایک مقالہ تھا جو مولانا منظور احمد نعمانی صاحب کے رسالہ ''الفرقان'' بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے لکھا گیا تھا اور اس میں افغانی کے تذکرے کو میں نے خلافِ مصلحت سمجھا۔

''مسئلہ قومیت'' نام رسالہ میں مولانا حسین احمد مدنی کے مقالہ کے جواب میں جو تحریر لکھی گئی ہے اُس میں ایک جگہ اُن اکابرین کی فہرست دی گئی ہے جنھوں نے وطنی قومیت کی مخالفت کی تھی۔ اُن میں غالباً سب سے پہلے اُنھوں نے جمال الدین افغانی کا نام لکھا ہے اور پھر اُنھی کے کچھ شاگردوں کے نام ہیں۔

سید جمال الدین افغانی کی تحریک کو جو استخلاصِ دیار المسلمین، اصلاحِ اُمت، قیامِ حکومتِ الٰہیہ اور تجدید و احیاے دین جیسے متنوع اور ہمہ گیر پہلوؤں پر محیط تھی، عالمِ اسلام میں زبردست پذیرائی ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے عالمِ اسلام میں اُن کے پیروکار پیدا ہو گئے۔ مفتی محمد عبدہ، مصطفیٰ کامل، ادیب اسحٰق، رشید رضا مصری، شیخ حسن البناء، اعرابی پاشا، محمد بک فرید، فرید وجدی، ایرانی انقلاب کے اوّلین معمار باقر ایرانی، سوڈان میں مہدی سوڈانی، لبیا میں امیر سید احمد سنوسی، الجزائر میں امام مسالی حج، شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ الطیب العقابی، ترکی میں شیخ بدیع الزمان نورسی اور حلیم پاشا، مراکش میں غازی عبدالکریم خطابی اور علال الفاسی، انڈونیشیاء میں تیکو عمر، شیخ وحی الدین اور عمر سعید آمینوتو، ملائشیاء میں شیخ جلال الدین طاہر اور افغانستان میں نادر شاہ غازی، یہ سب اُنھی کے پیروکار تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں عالمِ اسلام میں جتنی بھی ہنگامہ خیزی ہوئی ہے، وہ سب اُنھی کی مرہونِ منت ہے۔

عشق از فریادِ او ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

برصغیر کی نمایاں شخصیات میں سے سب سے پہلے شبلی نعمانی کو اُن کے پیروکار بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور یوں وہ ''دبستانِ افغانی'' کی ہندوستانی شاخ کے سربراہ بن گئے۔ 1880ء سے 1882ء تک جمال الدین افغانی ہندوستان میں مقیم تھے۔ اُن کی ذات سے شبلی کا ابتدائی تعارف اسی زمانے میں ہوا تھا۔ تاہم ذہنی و قلبی سطح پر اُن کی عقیدت مندی کا آغاز اُس وقت ہوا جب پیرس سے افغانی نے رسالہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ علی گڑھ

کالج کی لائبریری میں بھی آیا کرتا تھا اور اس رسالہ میں شائع ہونے والے عربی مضامین کا اُردو ترجمہ ہفت روزہ ''دارالسلطنت'' کلکتہ اور ماہنامہ ''مشیرِ قیصر'' لکھنؤ میں بھی شائع ہوتا رہا تھا۔ العروہ میں شائع ہونے والے دردانگیز مقالات کے مطالعہ کے بعد شبلی کے لیے علی گڑھ میں رہنا ناممکن ہوگیا۔ 1892ء میں وہ مصر چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کے شاگردِ خاص مفتی محمد عبدہ کی صحبت اختیار کی۔ مصر سے آپ 1893ء میں ترکی چلے گئے اور وہاں جیل میں انیسویں صدی کے روشن خیال عالم جمال الدین افغانی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور واپس ہندوستان آگئے۔ وطن واپسی پر اِس طویل دورہ کے بارے میں اُنھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''سفر بے شبہ ضروری تھا۔ جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا، وہ ہزاروں کتابوں سے نہیں ہوسکتا تھا''۔

(سفر نامہ مصر و روم و شام۔ شبلی)

یہاں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے باقاعدہ ایک علمی تحریک کا آغاز کیا۔ شبلی کے زیرِ اثر جن لوگوں نے تربیت پائی، اُن میں چار نام بہت اہم ہیں۔ سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد، حمیدالدین فراہی۔

گویا شبلی کی ذات سے چار سلسلوں کا آغاز ہوا۔ اُن میں سے پہلا سلسلہ سیرتِ رسول، احادیث وسنت، تاریخ اسلام اور سوانح نگاری میں دلچسپی رکھتا تھا۔ دوسرا سلسلہ تقابلِ ادیان اور مذہب وسائنس کے تقابلی مطالعے میں دلچسپی رکھتا تھا، تیسرے سلسلہ کے لوگ عمرانیات وسیاسیات سے شغف رکھتے تھے اور چوتھے سلسلے کو قرآنیات سے دلچسپی تھی۔ پہلے سلسلہ کا آغاز سید سلیمان ندوی سے ہوتا ہے۔ اُن کے جانشین ابوالحسن علی ندوی قرار پائے۔ عبدالماجد دریا آبادی تقابل ادیان اور مذہب وسائنس کے تقابلی مطالعہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کے جانشین شیخ احمد حسین دیدات ہوئے۔ عمرانیات وسیاسیات کے میدان میں ابوالکلام آزاد کی جانشینی کا حق ابوالاعلیٰ مودودی نے ادا کیا اور حمیدالدین فراہی کے جانشین امین احسن اصلاحی ہوئے۔ ابوالحسن علی ندوی کے دیوبندی فرقہ میں شامل ہونے کے بعد اُن کے اپنے حلقہ میں تو کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو سیرت اور احادیث وسنت پر دبستان شبلی کے اُصولوں کے مطابق تحقیق کرتا۔ لیکن دریا کے اُس کنارے پر ڈاکٹر حمیداللہ نے اس سلسلہ کو انتہائی شاندار طریقے سے آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمیداللہ کے جانشین ڈاکٹر محمود احمد غازی ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے سلسلہ کے ساتھ بھی ہوا۔ عبدالماجد دریا آبادی کے دیوبندی فرقہ میں شامل ہونے کے بعد اُن کے اپنے حلقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو اس سلسلہ کو آگے بڑھاتا، لیکن بمبئی میں شیخ احمد حسین دیدات جیسا مفکر پیدا ہوا جنھوں نے تقابل ادیان کے اس سلسلے کو شاندار انداز سے آگے

بڑھایا۔ شیخ احمد حسین دیدات کی وفات کے بعد اُن کی نشست وحیدالدین خان نے سنبھالی ۔ وہ ابوالاعلیٰ مودودی، امین احسن اصلاحی اور ابوالحسن علی ندوی تینوں سے فیض یاب ہوئے تھے اور اُن میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ اِن تینوں میں سے کسی کی بھی چھوڑی ہوئی نشست سنبھال سکتے تھے۔ لیکن ہر مقام پر اُن کا ڈگمگاتا ہوا قدم ''تعبیر کی غلطی'' کا شکار ہوگیا۔ وحیدالدین خان جب دین اور دُنیا کی تفریق کرتے ہیں تو وہ غلطی نہیں کرتے۔ غلطی وہ اُس وقت کرتے ہیں جب خالصتاً الہیاتی نقطہءنگاہ کے علاوہ دیگر نقطہ ہائے نظر سے کتاب وسنت کے علوم مرتب کرنے کو ناجائز قرار دے دیتے ہیں۔ اقبال اور ابوالاعلیٰ مودودی کی عمرانی فکر میں بڑی حد تک تعبیر کی غلطی کی گنجایش موجود ہے۔ لیکن اُن کا یہ فعل (یعنی سیاسی وعمرانی نقطہءنگاہ سے کتاب وسنت کے علوم مرتب کرنے کی کوشش) ہرگز ہرگز تعبیر کی غلطی کے زمرے میں نہیں آتا۔ یہ ہر زمانے کی ضرورت ہے کہ مختلف شعبہ ہاے علم وفن سے تعلق رکھنے والے مفکرین اپنے متعلقہ شعبہ کے نقطہءنظر سے کتاب وسنت کا مطالعہ کر کے نتائج مرتب کرتے رہیں۔ اقبال اور ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کوشش کر کے کوئی گناہِ کبیرہ نہیں کیا۔ بلکہ وحیدالدین خان جیسے لوگ اس قسم کی سعی وکاوش کی مخالفت کر کے تعبیر کی غلطی کا شکار ہو رہے ہیں۔

وحیدالدین خان اپنے مخصوص فطری میلانات اور ذہنی رجحانات کے باعث زیادہ دیر تک دبستان شبلی کی ردا نہ اوڑھ سکے اور جلد ہی قدامت پسند فرقوں میں سے دیوبندی فرقہ میں شامل ہو گئے، جس کی وجہ سے وہ دبستانِ شبلی کے اُن عظیم اساتذہ کے جانشین نہ بن سکے جن سے وہ فیض یاب ہوئے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ تقابلِ ادیان اور مذہب وسائنس پر اُن کے کام نے اُنھیں شیخ احمد حسین دیدات کا معنوی خلیفہ بنا دیا۔ یہ اُن کی عظمت ہے کہ دانش گاہِ الحاد سے اتنا دور جانے کے باوجود بھی ہم اُنھیں دبستانِ شبلی سے خارج نہیں کر سکتے۔ اُنھوں نے ایک طرف اسلام اور دیگر مذاہب (بالخصوص ہندوستانی مذاہب) کے تقابلی مطالعہ پر مبنی دعوتی وتحقیقی کتب تصنیف کیں اور دوسری طرف اسلام اور سائنس کے تقابلی مطالعہ پر گرانقدر کتابیں لکھیں۔ اس طرح اُنھوں نے احمد حسین دیدات کے کام کو آگے بڑھایا۔ اسی دوران ایک اور نوجوان محقق منظرِ عام پر آئے جو تقابل ادیان میں کمال کی حدوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ نیز اسلام اور سائنس کے تقابلی مطالعہ پر بھی اُن کی گرفت بہت گہری ہے۔ اس نوجوان کا پورا نام ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک ہے اور لوگ اُنھیں ڈاکٹر ذاکر نائیک کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر طب کے شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن طالب علمی کے زمانے میں وہ شیخ احمد حسین دیدات سے متاثر ہو گئے جس کی وجہ سے وہ دنیاے طب کو الوداع کہہ کر دینیات کے میدان میں چلے آئے۔ اُنھوں نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ پر مبنی اعلیٰ

کتابیں بھی لکھیں اور سائنس اور اسلام کے تقابلی مطالعہ پر مبنی کتب بھی۔ پھر اُنھوں نے اپنے آپ کو صرف تصنیف و تالیف کے کام تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس نہج پر ایک عظیم الشان دعوتی تحریک کا آغاز بھی کیا اور اس سے بھی بڑھ کر اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کر کے اس تحریک کو باقاعدہ انسٹیٹیوشنلا ئیز کیا۔ اور اُن پیش رووں کے قدامت پسند فرقوں کی طرف جھکاؤ سے اس فکر پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے تھے، اُن کا ازالہ بھی کیا۔ یہ منزلیں سر کرتے ہوئے اُنھیں زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھارت کے قدامت پسند فرقے اُن کی تحریک کو ''فتنۂ ذاکریت'' کہتے ہیں۔ اُن کا مؤقف ہے کہ وہ پینٹ شرٹ پہن کر فتنہ سازی کرتا پھرتا ہے۔ حال ہی میں بھارت کے ایک مولوی صاحب نے اُن کے بارے میں اپنے تحفظات کا یوں اظہار فرمایا:

''ذاکر نائیک کے پاس کسی دینی مدرسہ کی سند نہیں ہے۔ نیز اُنھوں نے کبھی اہلِ قلوب اور اربابِ باطن کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ نہیں کیا۔ اس وجہ سے اُن کا علمی رسوخ نا قابلِ اعتماد اور علمی معیار غیر مستند ہے۔ اُن کا فہم دین جنگل کے خودرو گھاس کی طرح ہے۔۔۔۔''

وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

دوسری طرف ذاکر نائیک کا رویہ یہ ہے کہ وہ زمانے کی پروا کیے بغیر دن رات اپنے کام میں مگن ہیں۔

تیسرے سلسلہ میں ابوالاعلیٰ مودودی کے حقیقی جانشین ڈاکٹر اسرار احمد ہیں۔ 1957ء میں جماعتِ اسلامی جس کام سے دستبردار ہوگئی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد نے اُس کا بیڑا اُٹھایا۔ 1966ء میں اُنھوں نے امین احسن اصلاحی کے جاری کردہ رسالہ ''میثاق'' کی ادارت سنبھالی۔ 1967ء میں ''تحریک رجوع الی القرآن'' کا آغاز فرمایا۔ 1972ء میں انجمن خدّام القرآن قائم کی۔ 1975ء میں انقلابی طریقِ کار کے ذریعہ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لیے تنظیم اسلامی بنائی۔ 1977ء میں لاہور میں مرکزی قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بعدازاں پورے پاکستان میں قرآن اکیڈمیوں کا جال بچھا دیا۔ 1987ء میں قرآن کالج قائم کیا۔ 1991ء میں ''تحریک خلافت پاکستان'' کے نام سے ایک عمومی تحریک کا آغاز کیا، جس کا مقصد اسلامیانِ پاکستان کو نظام خلافت کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اُن کی کامیابیوں میں ایک بڑی کامیابی یہ بھی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے وہ اراکین جنھوں نے 1957ء کے مشہور زمانہ اجتماع ماچھی گوٹھ میں انتخابی طریقہ کی حمایت کی تھی، وہ 1993ء میں نعیم صدیقی کی قیادت میں جماعتِ اسلامی سے علیٰحدہ ہو کر ''تحریکِ اسلامی'' کے نام سے منظّم ہوئے اور انقلابی راستے پر گامزن ہو گئے۔ علاوہ ازیں وہ تصنیف و تالیف میں بھی مگن رہے اور چند قابلِ قدر کتابیں منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ

ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک پہاڑ جیسی حقیقت ہے کہ وہ بھی زیادہ دیر تک راہِ اعتدال پر قائم نہیں رہ سکے اور جلد ہی قبائے رندی اُتار کر زُہد کا جامۂ صلاح وصفوت زیبِ تن کر لیا۔

قدامت پسندوں سے میل جول اور رسم وراہ رکھنے کے باعث اُن کے افکار ونظریات، منہج وترجیحات، سوچنے کے انداز، دیکھنے کے زاویے، ردّ وقدح کے پیمانے، خیر وشر کے معیارات، زندگی کے طور طریقے، مذاق ومزاج کے ڈھنگ، فطری میلانات اور طبعی رجحانات بالکل ویسے ہی ہو گئے ہیں جو دیو بندی فرقے کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے کسی شخص کے ہونے چاہییں۔ اُن کے پیروکار بھی اُنھی کی طرح کے مکمل طور پر دیو بندی نظریات کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس حلقہ میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو عمرانیات و سیاسیات کے اس سلسلہ کو دبستان شبلی کے اعلیٰ وارفع اُصولوں کے مطابق آگے بڑھا سکے۔ اقبال اکیڈمی سے وابستہ اسکالر احمد جاوید بچپن وجوانی میں ابوالکلام اور ابوالاعلیٰ کے زیر اثر رہے ہیں اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے پُرزور حامی ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بعد، اس سلسلہ کے نمایندہ احمد جاوید ہوں گے۔ احمد جاوید کو تین بڑے چیلنج درپیش ہیں۔

☆ اوّل یہ کہ اُنھیں روشن خیالی کے کم از کم اُس مقام کو برقرار رکھنا ہے، جس پر ابوالکلام فائز تھے۔

☆ دوم یہ کہ بیسویں صدی میں ابوالاعلیٰ مودودی نے کتاب وسنت کے اُصولوں کی روشنی میں اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، روحانی اور اخلاقی نظام کا جو ڈھانچا تشکیل دیا تھا، اُس کا بیشتر حصہ اب قصۂ پارینہ کی مانند ہو چکا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اکیسویں صدی کے احوال وظروف کے مطابق جدید تحقیقات کی روشنی میں اُس ڈھانچے کو از سرِ نو تشکیل دیا جائے۔

☆ سوم یہ کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے اقدامت پسندوں کی طرف جھکنے سے اس فکر پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں، اُن کا ازالہ کرنا ہے۔

یہ تینوں بہت بڑے چیلنج ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی صلاحیتیں اُنھیں عطا کی ہوئی ہیں، اُن کی بناء پر مجھے یقین ہے کہ وہ ان چیلنجوں سے نمٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

حمید الدین فراہی چوتھے سلسلے کے بانی تھے۔ اُن جیسے تحقیقی ذوق رکھنے والی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

دور ہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شدد
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

وہ قرآنیات میں دلچسپی رکھتے تھے اور اُنھوں نے اپنی عمرِ عزیز کے چالیس سال تحقیق کی وادیِ خموشاں میں گزارے۔ اُن کے بعد امین احسن اصلاحی نے جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد سے اپنی وفات تک چالیس سال تحقیق کی دنیا میں بسر کیے۔ جاوید احمد غامدی گزشتہ تیس سالوں سے اسی وادیِ نجد میں شورِ سلاسل بلند کیے ہوئے ہیں۔ یہ مجموعی طور پر ایک سو دس سال بنتے ہیں۔ اس قسم کی مضبوط تحقیقی روایت برِصغیر میں دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ دوسرے لوگ اِتنے ہی سال اُن سے پیچھے ہیں۔

امین احسن اصلاحی تحقیق میں مگن رہنے کے ساتھ ساتھ دعوت وتحریک کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ چنانچہ 1930ء کی دہائی میں اُنھوں نے ''تحریکِ تدبرِ قرآن'' کا آغاز فرمایا۔ ابوالکلام آزاد کی ''تحریکِ دعوتِ قرآن'' کے بعد قرآن کے نام پر اُٹھنے والی یہ برصغیر کی دوسری تحریک تھی۔ 1936ء میں اُنھوں نے ماہ نامہ الاصلاح جاری کیا اور دائرہ حمیدیہ قائم کیا۔ وہ مزید اقدمات کے حوالے سے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ پٹھان کوٹ سے ابوالاعلیٰ کی دعوت اُن کے کانوں میں پڑ گئی اور اُن کی حالت اس شعر کے مصداق ہوگئی کہ:

دیکھنا تقریر کی لِذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

اور یوں وہ تحریک تدبر قرآن' مدرسۃ الاصلاح' ماہ نامہ الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ دیگر احباب کے سپرد کر کے خود، غامدی صاحب کے الفاظ میں: ''فراہی کی خانقاہ سے ابوالاعلیٰ کے دارالاسلام میں پہنچ گئے''۔ 1947ء سے قبل جماعتِ اسلامی علمی و تحقیقی اور دعوتی و تربیتی کام کر رہی تھی۔ چنانچہ امین احسن اصلاحی اُس کی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ لیکن بعد میں جب جماعتِ اسلامی سیاسی میدان میں کود پڑی تو وہ اس کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہوتے چلے گئے۔

1947ء سے 1957ء تک دس سال ابوالاعلیٰ کے ساتھ اُن کی ''سرد جنگ'' رہی۔ امین احسن اصلاحی چاہتے تھے کہ پٹھان کوٹ کے دارالاسلام کے طرز پر پورے پاکستان میں ''جدید خانقاہوں'' کا جال بچھایا جائے۔ تاکہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی دینی تربیت کی جا سکے۔ جیسا کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ میں کی جاتی رہی تھی۔ نیز تربیتی اداروں کے علاوہ چند تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں تاکہ تحقیق کا کام ہوتا رہے۔ اس کے علاوہ دعوتی و تبلیغی کام کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس ابوالاعلیٰ کا خیال تھا کہ آئین سازی کے اس اہم موقع پر اگر ہم نے آگے بڑھ کر لادینیت اور اشتراکیت کے حدی خوانوں کے ہاتھ نہ تھامے تو پاکستان کا حال مصطفےٰ کمال کے ترکی سے مختلف نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ متفقہ آئین تشکیل پانے کے بعد اُس کو تبدیل کرنا خونی انقلاب کے بغیر ممکن نہ ہوگا اور خونی انقلاب

خود نبی پاک کے منہج کے خلاف ہے۔اور یوں دو نصب العینوں کے مابین کشمکش کا آغاز ہو گیا۔علمی و تحقیقی، دعوتی و تربیتی اور تبلیغی سرگرمیوں کے حامی گروہ کے سربراہ امین احسن اصلاحی تھے اور اُن کا ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد دے رہے تھے۔جبکہ سیاسی سرگرمیوں کے حامی گروہ کے سربراہ ابوالاعلیٰ مودودی تھے اور اُن کا ساتھ نعیم صدیقی دے رہے تھے۔ بالآخر 1957ء میں یہ کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور ماچھی گوٹ میں ارکانِ جماعت کا اجتماع طلب کیا گیا۔اُن کے سامنے دونوں گروہوں نے اپنی اپنی تجاویز رکھیں۔ جماعت کے ارکان کی اکثریت نے سیاسی سرگرمیوں کے حق میں فیصلہ دیا۔امین احسن اصلاحی کو اس سے سخت دھچکا لگا۔لیکن اُس وقت جماعت کا نظام شورائی تھا اور امیر شوریٰ کی رائے کا پابند تھا۔ اس وجہ سے امین احسن کا خیال تھا کہ وہ ارکان شوریٰ کو اپنے ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔اس وجہ سے وہ اتنے مایوس نہیں ہوئے تھے۔تاہم بعد میں جب ایک قرارداد کے ذریعہ امیر کو لامحدود اختیارات سونپ دیئے گئے ۔ نیز امیر کے لیے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے شوریٰ کی رائے کا پابند ہونے کی شرط بھی ختم کر دی گئی تو امین احسن اصلاحی جماعت اسلامی کے دینی مستقبل سے مکمل طور پر مایوس ہو گئے۔ پھر جماعت سے علیحدہ ہونے میں اُنھوں نے دیر نہیں لگائی۔

سترہ سال جماعتِ اسلامی میں ضائع کرنے کے بعد اپنی تحریک کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے۔ جسے ہندوستان میں مدرستہ الاصلاح کے علماء، اساتذہ وطلبہ اور دائرہ حمیدیہ کے اراکین ومعاونین پوری شان کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے۔پاکستان میں اُس وقت تک اس تحریک کا واحد سرمایہ امین احسن اصلاحی کی ذات تھی اور وہ بھی اُس عمر میں تھے جہاں آخری خواہشات اکثر دم توڑ دیتی ہیں۔وسائل کی کمی اور اپنی ضعیفی اور کمزوری کے علی الرغم، اُنھوں نے بڑی تن دہی سے دن رات کام کیا اور پاکستان میں اپنی تحریک کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

جدید زمانے میں قرآن اور اسلام کے نام پر جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں، اُن میں شبلی کی تحریک کے علاوہ باقی سب تحریکوں نے عوام اور خواص کو مخاطب کیا۔اور اُن تحریکوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے۔اس کے برعکس شبلی اور امین احسن نے صرف اخص الخواص کو ہی اپنی بارگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ یہ طریقہ اُنھوں نے یورپ کی جدید تحریکوں کو سامنے رکھ کر اخذ کیا تھا۔ یورپ کی تحریکوں کا کل سرمایہ چار پانچ بڑے مفکرین ہوتے ہیں۔شور و شغب، جلسہ، کانفرنس، مارچ، ہنگامہ، احتجاج، ہڑتال، دھرنا دینا، جماعتوں کے قیام کی دعوت اور سمع وطاعت کی بیعت جیسی لغویات وہاں کی علمی تحریکوں میں نہیں ہوتیں۔وہ چار پانچ مفکرین دن رات تحقیق میں مگن رہتے ہیں۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی تحقیق سے مشرق ومغرب کی علمی دنیا کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ برصغیر میں شبلی نے یہی طریقہ اپنایا

تھااور اُس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تحریک کی بنیاد اسی اُصول پر رکھی کہ عوام وخواص کا غول جمع کرنے کے بجاے دس پندرہ باصلاحیت نوجوانوں کی صحیح تربیت کی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اُنھوں نے باصلاحیت نوجوانوں کی تلاش میں حلقہ ہاے تدبرِقرآن قائم کیے۔ اگلے مرحلہ میں اُنھوں نے حلقہ ہاے تدبرِقرآن کے شرکاء کو رخصت دے کر صرف چند نوجوانوں کو اپنے پاس رکھا اور اُن کی تربیت شروع کر دی۔ تیسرے مرحلہ میں ادارہ تدبرِقرآن قائم کر کے اس تحریک کو باقاعدہ انسٹیٹیوشنلا ئیز کیا۔ ابوالکلام کے دارالارشاد اور ابوالاعلیٰ کے دارالاسلام کے طرز پر قائم ہونے والے اس ادارے کا قیام 1973ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ ایک حوالے سے اس ادارے کو مذکورہ دونوں اداروں پر فوقیت حاصل تھی اور وہ یہ کہ دارالارشاد اور دارالاسلام دونوں اداروں کا اوّلین مقصد تربیت تھا۔ تحقیق کو ثانوی حیثیت حاصل تھی، جبکہ اس کے برعکس امین احسن کے ادارے کا اولین مقصد تحقیق تھا، تربیت کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ اُن کے مطابق تحقیق خود ہی انسانوں کی تربیت کرتی ہے۔ تحقیق ہوگی تو تربیت خود بخود ہوتی رہے گی۔

امین احسن اصلاحی نے ایک اور کمال یہ کیا کہ اپنے زیرِتربیت نوجوانوں کو صوفی و مُلّا کی صحبت سے دور رکھا۔ اگر کوئی نوجوان قدامت پسندوں سے میل جول یا رسم و راہ رکھتا تھا تو وہ ایک دو مرتبہ اُسے متنبہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''ان لوگوں کو سر پر بٹھا کر ان سے کیا لینا ہے۔ ہماری تو ساری جدوجہد انھی لوگوں کے خلاف ہے''۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص باز نہ آتا تو وہ فوراً اُسے اپنے حلقہ سے نکال دیتے تھے، کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ قدامت پسندوں کی محفل میں وہی شخص جاتا ہے جس کی اپنی ذہنیت قدامت پسندانہ ہو۔

کُند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز بہ باز

[باقی]